ماہنامہ میثاق لاہور

اشاعت خصوصی — مئی ۱۹۸۰ — مشتمل بر

نشر القرآن

یعنی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی سورۂ توبہ کی آیات ۹۸ تا ۱۲۹ کے درس پر مشتمل تقاریر جو ریڈیو پاکستان

سے جنوری تا اپریل ۸۰ء ہر جمعہ کی صبح نشر ہوئیں ۔

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

چندہ سالانہ ۲۰/- اس شمارے کی قیمت ...

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۹	مئی ۱۹۸۰ء	عدد ۵

تقدیم

'میثاق' کی پیش نظر اشاعت خصوصی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس کے موقع پر شائع ہو رہی ہے اور اس میں راقم کی چودہ نشری تقاریر یکجا ہدیہ قارئین کی جارہی ہیں۔ ان تقریروں کو اس طرح یکجا شائع کرنے کا خیال اس لئے آیا کہ سورۂ توبہ کے اس حصے میں ایمان حقیقی کے تقاضوں کے پس منظر میں منافقت کی اصل حقیقت پوری طرح بے نقاب ہوگئی ہے اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن حکیم میں 'النفاق' کے موضوع پر یہ مقام ''ذروۂ سنام'' یا 'CLIMAX' کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمیں اس مہلک مرض کی صحیح پہچان عطا فرمائے اور اس سے بچنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

اس اشاعت کے آخر میں بطور ضمیمہ ''ایک نئی تعلیمی سکیم'' کا تعارف شامل کیا جا رہا ہے قارئین سے استدعا ہے کہ اسے بغور پڑھیں اور اپنے جگر گوشوں کو اللہ کے دین متین اور کتاب مبین کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے ارادوں سے ہمارے حوالے کریں.....تاکہ وہ ان کے لئے بہترین صدقہ جاریہ بن سکیں۔

والسلام من اتبع الھدیٰ!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

پبلشر : ڈاکٹر اسرار احمد ✱ طابع : رشید احمد چوہدری

مطبع : مکتبہ جدید پریس ' شارع فاطمہ جناح ' لاہور

مقامِ اشاعت ۳۶ - کے ' ماڈل ٹاؤن ' لاہور فون : ۸۵۲۶۱۱ — ۸۵۲۶۸۳

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۹۸ تا ۹۹ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے: اور ان بدّوؤں میں ایسے بھی ہیں جنھیں وہ انفاق جو وہ کرتے ہیں (خواہ مخواہ کا) تاوان نظر آتا ہے، اور وہ تمھارے لئے گردشوں کی آس لگائے بیٹھے ہیں (حالانکہ) بُری گردش کی زد میں وہ خود ہیں اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے — اور ان بدّوؤں ہی میں سے وہ بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخر پر پختہ ایمان رکھتے ہیں، اور جو انفاق وہ کرتے ہیں اُسے اللہ کے قرب اور رسولؐ کی دُعاؤں کے حُصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ وہ یقیناً ان کے حق میں سببِ قُرب ہے۔ عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے!"

سورہ توبہ کی آیات ۷۳ تا ۷۴ کے علاوہ جو فتح مکّہ سے متّصلاً قبل یا اس کے فوراً بعد نازل ہوئیں بقیہ پوری سورۂ توبہ ۹ھ میں سفرِ تبوک سے متّصلاً قبل یا اس کے دوران یا اس کے فوراً بعد نازل ہوئی۔ چنانچہ اس کا آخری حصّہ جو گیارھویں پارے میں شامل ہے اواخر ۹ھ میں تبوک سے واپسی کے بعد نازل ہوا —!

ظاہر ہے کہ اس وقت نہ صرف یہ کہ ایک محکم اور وسعت پذیر اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ بلکہ مسلمانوں نے ایک باقاعدہ اُمّتِ مسلمہ کی صورت اختیار کر لی تھی جس کی نفری روز بروز بڑھ رہی تھی۔ لیکن فطری اور منطقی طور پر اس افزونی و افزودگی کا معیار یکساں نہ تھا — اور مسلمانوں کی جماعت میں کافی مختلف النّوع اور متفاوت المرتبہ لوگ شامل ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان میں ایک تقسیم تو یہ تھی کہ اوّلاً مہاجرینِ مکّہ تھے، پھر انصارِ مدینہ اور پھر اردگرد کے قبائل کے بادیہ نشین۔ یہ تقسیم اگر ایک جانب خالص ارضی و جغرافیائی تھی، تو

دوسری جانب اس میں ایک زمانی تدریج بھی تھی۔ یعنی سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے مہاجرین ان کے بعد نمبر تھا انصار کا، اور پھر نوبت آئی تھی اہلِ بادیہ کی، اور اسی سبب سے ان کے مابین ایک فطری فرقِ مراتب بھی تھا۔ پھر ایک دوسری تقسیم حقیقی و معنوی تھی، یعنی پہلا نمبر تھا صادق الایمان اور راسخ الیقین لوگوں کا، اور ان میں بھی: "اَنْتَ قَدَمُ فَاَنْتَ قَدَمٌ!" کے مطابق اولیت حاصل تھی السابقون الاوّلون کو، اور ان کے بعد درجہ تھا متبعین باحسان کا۔ دوسرے نمبر پر تھے سچے لیکن ضعیف الایمان لوگ۔ پھر اُن کے بھی بہت سے درجے تھے۔ چنانچہ ایک وہ بھی تھے جن سے کبھی کبھی خطا سرزد ہو جاتی تھی یا کوتاہی کا ارتکاب ہو جاتا تھا۔ پھر وہ تھے جن میں نیکی اور بدی کا امتزاج کچھ مستقل سا نظر آتا تھا۔ گویا ان کی شخصیتوں میں خیر و شر کے دھارے "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ" کی سی کیفیت کے ساتھ مسلسل رواں تھے۔ اور آخری نمبر پر وہ تھے جن کے دلوں میں کوئی فساد یا نیتوں میں کوئی فتور تو نہ تھا۔ گویا نفاق سے تو وہ بری تھے لیکن اُن کے ایمان کی نوعیت بس یہ تھی کہ یا تو حالات کے رُخ کو بدلتے دیکھ کر انہوں نے بھی اسلام کی طرف رُخ کر لیا تھا یا قبائلی نظام کے تحت اس لئے ایمان لے آئے تھے کہ اُن کے قبیلے کے سرکردہ لوگوں (ELDERS OF THE CLAN) نے اسلام لے آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گو ایمانِ حقیقی کی جڑیں ابھی تک اُن کے قلوب تک پہنچ ہی نہ سکی تھیں، بفحوائے الفاظِ قرآنی قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ط! (الحجرات: ۱۴): "یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ اے نبی! کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں یا ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے، اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا!"۔۔۔ اور سب سے آخر میں نمبر آتا تھا منافقین کا۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں بھی درجوں اور مرتبوں کا بہت فرق موجود تھا بقول شاعر ؎

نہ ہر زن زن است، نہ ہر مرد، مرد ۔۔۔ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک جامع اور بھرپور تبصرہ اُمّتِ مسلمہ کے جسدِ ملّی میں شامل ان مختلف عناصر پر ایسا کر دیا جائے، جس سے نہ صرف یہ کہ موجود الوقت مخلص مسلمانوں اور خاص طور پر ان کے ذمّہ دار حضرات کو ایک گہری بصیرت حاصل ہو جائے، اور وہ مختلف عناصر و طبقات کے ساتھ ان کو پوری طرح پہچان کر اور ان کے باطنی احساسات

وجذبات سے پوری طرح آگاہ ہوکر گویا علیٰ وجہ البصیرت، معاملہ کر سکیں۔ بلکہ تحریکی و انقلابی نفسیات کے ضمن میں مسلمانوں کو ایک ابدی رہنمائی بھی حاصل ہوجائے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کے آخری حصّے میں یہ مضامین پوری تفصیل اور نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ؎

اعراب یعنی عرب کے بادیہ نشین متذکرہ بالا تقسیموں میں سے مکانی و زمانی دونوں تقسیموں کے اعتبار سے تو آخری نمبر پر تھے ہی یعنی مہاجرینِ مکّہ اور انصارِ مدینہ کے بعد — واقعہ یہ ہے کہ معنوی تقسیم کے اعتبار سے بھی اکثر و بیشتر ان کا نمبر آخر ہی میں آتا تھا۔ چنانچہ یہی بات ہے جو زیرِ درس آیات سے متصلاً قبل والی آیت میں فرمائی گئی تھی یعنی:

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ ؕ

یعنی " یہ بادیہ نشین کفر اور نفاق میں بھی (دوسرے طبقات کے مقابلے میں) زیادہ پختہ اور شدید ہیں، اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل فرمایا ہے اُس کے فہم وادراک سے بھی کچھ زیادہ ہی محروم اور تہی دست ہیں!" — اس کی وجہ بھی بادنیٰ تأمّل سمجھ میں آجاتی ہے کہ ایک تو شہروں کے مہذّب اور متمدّن لوگوں کے مقابلے میں دیہاتی یوں بھی کچھ زیادہ ہی اُجڈ اور سخت و کرخت ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم آغازِ وحی کے بعد تیرہ ۱۳ سال مکّے میں مقیم رہے اور دس سال مدینے میں۔ لہٰذا اہالیانِ مکّہ و مدینہ کو آپؐ کی صحبت کا فیض اور قرب کی برکتیں مسلسل حاصل ہوتی رہیں، جن سے صادق الایمان لوگوں نے تو بھرپور فائدہ اٹھایا ہی تھا، واقعہ یہ ہے کہ بالکل محروم کافر و منافق بھی نہ رہے۔ چنانچہ خواہ وہ زبان سے ایمان نہ لائے تاہم ان کے دل بھی آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت و حقانیت کے پورے معترف رہے اور ان کی آنکھیں بھی آپؐ کے رُوئے انور کے جمالِ جہاں تاب اور آپؐ کے اخلاقِ حسنہ اور خصائلِ کریمانہ کی ضیاپاشیوں سے مستفید ہوتی رہیں۔ جب کہ عرب کے عام بادیہ نشین ان سے محروم تھے۔ لہٰذا ان میں سے جو کافر یا منافق تھے ان کے کفر و نفاق کی شدت کا کیا ٹھکانہ —!!

آیت ۹۸ میں اسی شدّتِ نفاق کی نقشہ کشی کی گئی ہے کہ یہ بدّو کسی وقتی یا فوری سی تحریک کی بنا پر یا کسی مصلحت کے تحت ایمان تو لے آئے، لیکن ان پر اسلام کی جانب سے عائد کردہ پابندیاں سخت شاق گذر رہی ہیں۔ پنج وقتہ نمازوں کا معاملہ

تو وہ جیسے تیسے نبھا لیتے ہوں گے، اور نہ بھی نبھاتے ہوں تو آخر دیہات میں کون سے محتسب موجود تھے جو نگرانی کرتے۔ البتہ زکوٰۃ کا معاملہ ان کے حق میں ٹیڑھی کھیر بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے لئے تو ظاہر ہے کہ سال بہ سال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تحصیلدار آ جاتے تھے اور انہیں خواہی نخواہی زکوٰۃ ادا کرنی ہی پڑتی تھی۔ چنانچہ اسی کے ضمن میں فرمایا کہ مجبوراً دے تو دیتے ہیں لیکن بالکل ایسے جیسے چٹی بھرنی پڑ رہی ہو یا تاوان ادا کرنا پڑ گیا ہو۔ اگلے الفاظ نے ان کی باطنی کیفیت کو اور واضح کر دیا کہ اب ان کی واحد آس یہ ہے کہ گردشِ فلک کا کوئی چکر ایسا چلے کہ مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار ختم ہو اور یہ اس خواہ مخواہ کے تاوان سے نجات پائیں۔ چنانچہ بعد کے حالات نے بالکل یہی نقشہ پیش بھی کر دیا کہ جیسے ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا ان بادیہ نشینوں میں ایک عام بغاوت پیدا ہو گئی، اور ان میں سب سے بڑی تعداد مانعینِ زکوٰۃ ہی کی تھی۔ اس وقت اِس آیۂ مبارکہ کے آخری الفاظ یعنی "علیہم دائرۃُ السَّوءِ!" یعنی "بری گردش ان ہی پر ہے!" صورتِ واقعہ کا رُوپ دھار کر سامنے آئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آہنی عزم اور صادق الایمان مسلمانوں بالخصوص "سَیفٌ مِّن سُیوفِ اللّٰہ" خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلواروں نے سیلاب کا رُخ موڑ کر رکھ دیا ؎

آیت ۹۹ نے تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کر دیا۔ یعنی یہ کہ یہ کیفیت تمام کے تمام بدّوؤں کی نہیں ہے، اُن میں سے ایسے صادق الایمان لوگ بھی موجود ہیں جو زکوٰۃ و صدقات ادا کرتے ہوئے اور انفاق فی سبیل اللہ کی سعادت حاصل کرتے ہوئے دِلی مسرّت محسوس کرتے ہیں، اور جن کے نزدیک اس انفاق کے ذریعے حاصل ہونے والے قرب و رضائے الٰہی اور رضاء و دُعائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قیمتی چیز کوئی اور ہے ہی نہیں۔ آخر میں ایسے لوگوں کو بشارت دے دی گئی کہ وہ مطمئن رہیں کہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا انہیں بھرپور طور پر حاصل ہو گئی — اور رحمتِ خداوندی انہیں اپنے سائے میں لے لے گی۔ ؎

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہونے کی سعادت عطا فرمائے۔

آمین یا ربّ الاوّلین والآخرین!

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ
بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمِمَّنْ
حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا
عَلَي النِّفَاقِ ۡ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ
يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۰۰ ، ۱۰۱ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے : "اور سب سے پہلے سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے ، اور جنھوں نے ان کی پیروی کی عمدگی کے ساتھ - اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے - اور اس نے ان کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں ، جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی ، جن میں وہ ہمیشہ ہمیش - یہ بڑی کامیابی ہے — اور جو تمھارے ارد گرد بدّو ہیں ان میں بھی منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی - یہ منافقت میں بہت مشّاق ہو گئے ہیں - تم انہیں نہیں جانتے ، ہم جانتے ہیں - عنقریب ہم انہیں دوبار سزا دیں گے ، اور پھر وہ عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے !"

گذشتہ درس میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ کے مدنی دَور اور اس کے بھی بالخصوص آخری زمانے میں اُمّتِ مسلمہ کے جسدِ ملّی میں کافی مختلف النّوع عناصر جمع ہو گئے تھے - اس لئے کہ اسلام تو ایک قانونی حیثیت ہے جو کلمۂ شہادت ادا کرتے ہی کسی بھی انسان کو حاصل ہو جاتی ہے ، اور اگر وہ ارکان اسلام کا پابند رہتا ہے اور شعائرِ اسلامی کا احترام کرتا ہے تو یہ قانونی حیثیت برقرار رہتی ہے خواہ اپنی دلی کیفیات کے اعتبار سے وہ پکّا منافق ہی کیوں نہ ہو - سورۂ توبہ میں نفاق کا مضمون بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ وارد ہوا ہے اور منافقین کے ظاہری احوال بھی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور ان کی باطنی کیفیات اور قلبی احساسات کی بھی پردہ کشائی فرمائی گئی ہے - اسی ضمن میں فوری تقابل کے طور پر مسلمانوں کے جسدِ ملّی میں شامل جملہ عناصر پر اجمالی

تبصرہ کیا جارہا ہے تاکہ مسلمانوں میں ایک عام بصیرت پیدا ہو جائے، اور وہ لوگوں کو پہچان سکیں کہ کون کیا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے دو انتہاؤں کا ذکر کیا گیا۔ یعنی ایک جانب مومنین صادقین اور دوسری جانب منافقین۔ پھر مومنینِ صادقین کے بھی دو گروہوں کی جانب اشارہ کیا گیا، یعنی ایک جانب مہاجرینِ مکّہ اور دوسرے انصارِ مدینہ ___ اور منافقین کے بھی دو ہی گروہوں کی نشاندہی کی گئی یعنی ایک منافقینِ مدینہ اور دوسرے بادیہ نشین منافقین۔ اور اہم ترین یہ کہ مومنینِ صادقین کے بھی دو درجوں یا مرتبوں کا تعین کیا گیا یعنی ایک السّابقون الاوّلون اور دوسرے متبعین باحسان ___

اس طرح مومنینِ صادقین کے ضمن میں گویا دو تقسیمیں سامنے آئیں۔ ایک ظاہری دوسری معنوی، ظاہری تقسیم کے اعتبار سے مومنین صادقین مہاجرین اور انصار میں منقسم تھے اور معنوی تقسیم کے اعتبار سے السّابقون الاوّلون اور متّبعین باحسان میں۔ ان میں سے پہلی تقسیم تو مشہور و معروف ہے اور اس کے ضمن میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، البتّہ دوسری تقسیم وضاحت طلب ہے :

السّابقون الاوّلون سے مراد وہ صحابہ کرامؓ ہیں جنہوں نے جیسے ہی آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت سُنی فوراً لبّیک کہی اور اس راستے میں کسی ہچکچاہٹ یا ششِ و پنج کو آڑے نہ آنے دیا۔ یہ کیفیت اپنے آخری نقطۂ عُروج پر نظر آتی ہے حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں جن کے بارے میں خود آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شہادت موجود ہے کہ میں نے جس کسی کے سامنے اپنی دعوت پیش کی اس نے کچھ نہ کچھ توقّف ضرور کیا خواہ ایک لمحہ کیلئے ہو سوائے ابوبکرؓ کے کہ اُس نے قطعاً کوئی توقّف نہ کیا اور فوراً میری تصدیق کی۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ دو چیزیں ضروری ہیں : ایک یہ کہ انسان کی فطرت اپنی صحّت و سلامتی پر بہ تمام و کمال برقرار ہو۔ گویا اس کی فطرت کا روغن اتنا صاف و شفّاف ہو کہ خود بخود بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہو خواہ ابھی آگ نے اسے چھوا بھی نہ ہو، بفحوائے الفاظِ قرآنی: "یَکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَ لَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ" ___ اور اگر آگ چھو لے تو کیا ہی کہنے یہ "نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ" کے مصداق ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان میں جرأت و شجاعت کا مادّہ بھی موجود ہو کہ جب کسی چیز کا حق ہونا اس پر منکشف ہو جائے تو پھر ماحول کی ناسازگاری

یا لوگوں کی مخالفت اُسے ہراساں نہ کر سکے اور وہ "ہر چہ باد ا باد" کے انداز میں اپنی کشتی کو موجوں کے حوالے کر دے۔ جس انسان میں یہ دونوں اوصاف موجود ہوں وہ دعوتِ اسلامی کے ضمن میں "السّابقون الاوّلون" میں شامل ہو جاتا ہے، اور دعوتِ حق جیسے ہی اس کے کانوں تک پہنچتی ہے وہ بالکل اسی طرح حاضر ہو جاتا ہے جیسے کوئی نمازی جو گھر پر صرف اذان کے انتظار میں رُکا ہوا ہو، اور جیسے ہی اذان کی آواز اس کے کان میں پڑے فوراً مسجد کی جانب روانہ ہو جائے۔ اِسی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے قرآنِ حکیم میں سورۂ مائدہ کی اُس آیت میں جس سے ساتویں پارے کا آغاز ہوتا ہے یعنی

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝	اور جب وہ سنیں جو اترا ہے رسولؐ پر تو تو دیکھے ان کی آنکھوں کو کہ ان سے آنسو بہہ نکلتے ہیں حق کی اس پہچان کی وجہ سے جو انہیں حاصل ہوئی۔ پکار اٹھتے ہیں اے ربّ ہمارے ہم ایمان لائے پس لکھ لے ہمارے نام گواہی دینے والوں کے ساتھ ــــ!!
(۸۴)	

اور اسی کی جانب اشارہ ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۹۳ کے ان الفاظ میں کہ:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا	(یعنی وہ کہتے ہیں) اے ربّ ہمارے! ہم نے سُنا ایک پکارنے والے کی پکار کو کہ منادی کر رہا ہے ایمان کی۔ پس ہم ایمان لے آئے!

الغرض مومنینِ صادقین میں اوّلین درجہ ان السّابقون الاوّلون کا ہے۔ اور یہی ہیں جن کے بارے میں سورۂ واقعہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝	اور سبقت کرنے والے تو سبقت کرنے والے ہیں ہی۔ یہی ہوں گے مقرّبین بارگاہِ ربّانی!

گویا جنھوں نے یہاں ایمان میں سبقت کی وہی وہاں جنّت میں سب سے اعلیٰ رُتبوں پر فائز ہوں گے۔

ان کے بعد نمبر آتا ہے "مُتّبعینَ باحسان" کا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو السّابقون الاوّلون کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ اس قدر قلیل تاخیر

کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کی ذہنی و فکری صلاحیتیں اتنی چاق و چوبند نہ ہوں جتنی السّابقون الاوّلون کی۔ چنانچہ حق کے پہچاننے ہی میں انہیں کچھ دیر لگ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں پہل کرنے کی جراُت نہ ہو۔لیکن جب وہ لوگوں کو سبقت کرتے دیکھ لیں، اور ان کے سامنے کچھ لوگ حق کے لئے تکالیف و مصائب برداشت کر کے ایک نمونہ پیش کر دیں تو پھر ان کی ہچکچاہٹ بھی ختم ہو جاتی ہے اور وہ پیش قدمی کرتے ہیں اور حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ان کی ابتدائی ہچکچاہٹ بالکل عارضی ہوتی ہے اور جب وہ ایک بار دعوتِ حق پر لبّیک کہہ دیتے ہیں تو پھر ان میں کوئی تذبذب باقی نہیں رہتا، اور تن من دھن اللہ کی راہ میں نثار کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اُن کی اسی کیفیت کو "بِاِحْسَانٍ" کے الفاظ سے واضح فرمایا یعنی یہ کہ ان کا یہ اتّباع باحسنِ وجوہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی نفاق یا دوغلا پن تو دور رہا۔کسی ضعف اور کمزوری کی آمیزش بھی نہیں رہتی۔

مومنینِ صادقین کی ان دونوں جماعتوں کے بارے میں فرمایا کہ: اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے!"۔ یہ تعریف و تحسین کے وہ سب سے اعلیٰ و ارفع الفاظ ہیں جو اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کے لئے استعمال فرماتا ہے۔ اُن کا ایک عام مفہوم تو وہ ہے جو ظاہر الفاظ سے بھی عیاں ہے اور ویسے بھی مشہور و معروف ہے یعنی اللہ اپنے بندے کے ایمان و اسلام، اطاعت و فرمانبرداری اور اس کی راہ میں سرفروشی و جانفشانی سے راضی ہو گیا، اور بندہ اس جزا اور اجر و ثواب پر پوری طرح راضی ہو جائے گا جو اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے عطا فرمائے گا۔ لیکن اس کا ایک نسبتاً گہرا مفہوم بھی ہے اور وہ ہے باہمی رضا کا ایک دو طرفہ تعلّق جو ایمانِ حقیقی کے نتیجے میں بندے اور ربّ کے مابین پیدا ہو جاتا ہے اور جسے "مقامِ تسلیم و رضا" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کے بارے میں علاّمہ اقبال مرحوم نے بالکل بجا طور پر کہا ہے کہ ؎

"بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا ⁂ چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!"

واقعہ یہ ہے کہ اس نسبت و تعلّق کے پیدا ہو جانے سے جو ذہنی سکون اور قلبی اطمینان انسان کو حاصل ہو جاتا ہے، اس سے اس کی یہ دُنیوی زندگی بھی جنّت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ جیسے کہ نہایت عارفانہ قول ہے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کہ: "ان جنّتی معی!" یعنی: "میری جنّت میرے پاس موجود ہے!"۔ واضح رہے کہ یہ جملہ امامِ موصوف

نے کہا بھی اس وقت صاحب حکومتِ وقت نے انہیں گرفتار کر کے قید خانے میں ڈالا ہوا تھا اور ہر طرح کی تعذیب و اذیّت ان پر روا رکھی جا رہی تھی ۔

آخر میں ان صادق الایمان لوگوں کی اُخروی جزاء کا ذکر بھی فرما دیا گیا۔ یعنی اُن باغات میں داخلہ اور اُن میں ہمیشہ کا قیام، جن کے دامن میں ندّیاں بہتی ہوں گی ۔۔ ساتھ ہی وضاحت فرما دی گئی کہ اصل اور بڑی کامیابی اسی جنّت کا حصول ہی ہے۔ ۔

اگلی آیت میں منافقین کا ذکر ہے، اور ان کے ضمن میں وضاحت فرما دی گئی ہے کہ اب وہ اپنی منافقت میں اتنے منجھ گئے اور اپنے دوغلے کردار کے اتنے مشّاق و ماہر بن گئے ہیں کہ اُن کو پہچاننا آسان کام نہیں رہا۔ مَرَدَ کے معنی امام راغب اصفہانی نے تو بیان کئے ہیں: "تَعَرِّیْ عَنِ الْخَیْرَاتِ!" یعنی نیکیوں اور بھلائیوں سے بالکل عاری ہو جانا۔ ویسے اکثر مفسّرین نے یہاں اسے مَرَنَ کے مفہوم میں لیا ہے یعنی عادی و خوگر ہو جانا۔ بہرحال مراد یہی ہے کہ سالہا سال کی مشق کے باعث اپنی کمزوریوں کو چھپانے اور اپنے سازشی ذہن پر مصلحانہ رنگ کا ملمّع کرنے میں ان منافقین کی مہارت اب اتنی بڑھ چکی ہے کہ اے مسلمانو! تم انہیں نہیں پہچان سکتے۔ لیکن اس سے کوئی حرج واقعہ نہیں ہوتا، اس لئے کہ اللہ انہیں خوب پہچانتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اصل معاملہ تو اسی سے ہے۔ اہل ایمان کو جزا بھی وہی دینے والا ہے، اور اہلِ کفر و نفاق کی سزا کا معاملہ بھی اصلاً اسی کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا وہ خواہ کتنے ہی ماہر و مشّاق ہو جائیں اور کیسے ہی خوشنما لباس میں اپنے اصل گھناؤنے کردار کو چھپانے کی کوشش کریں اللہ کی نگاہوں سے کسی طرح نہیں چھُپ سکتے۔ وہ انہیں دو مرتبہ سزا دے گا، اور بالآخر جہنّم کے عذابِ عظیم میں جھونک دے گا۔ دو مرتبہ کے عذابوں کے بارے میں مفسّرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ لیکن جس مفہوم پہ زیادہ اتّفاق ہوا ہے وہ یہ کہ پہلا عذاب اس دُنیا کی رسوائی کا ہے، اور دوسرا عذاب عالمِ برزخ کا۔ اور اس کے بعد یومِ قیامت سے آغاز ہو گا اصل عذابِ عظیم کا ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کے عذاب سے محفوظ رکھے اور دُنیا اور آخرت دونوں کی رسوائی سے بچائے ۔۔۔ بالخصوص نفاق کے روگ سے ہمارے قلوب کو پاک کر دے۔ آمین ۔۔۔ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا
عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا
وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ
يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ
اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ
رَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ
اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۰ میں مومنین صادقین کی چار جماعتوں یعنی :——
السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ
بِاِحْسَانٍ کے ذکر اور آیت ۱۰۱ میں منافقین کے دو گروہوں یعنی منافقین مدینہ اور منافقین اہل بادیہ کے تذکرے کے بعد اب آیت ۱۰۲ سے آیت ۱۰۶ تک کچھ ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو ان دو انتہاؤں کے بین بین تھے۔ آیات کا ترجمہ یہ ہے :

"اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انہوں نے گڈمڈ کر لیا ہے ایک نیک کام کو دوسرے برے کام کے ساتھ۔ اُمید ہے کہ اللہ ان پر عنایت فرمائے، بے شک اللہ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ (اے نبیؐ!) آپ ان کے اموال میں سے صدقہ وصول کر لیں۔ اس طرح آپ ان کو پاک بھی کریں گے اور ان کی صحیح نشوونما بھی ہوگی، اور ان کے لئے دُعا بھی کیجئے۔ یقیناً آپ کی دعا ان کے حق میں باعثِ تسکین ہے اور اللہ سُننے والا، جاننے والا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی

توبہ قبول فرماتا اور ان کے صدقات کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے، اور یہ کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے، ان سے کہہ دیجئے کہ عمل کرو آئندہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اہلِ ایمان تمہارے طرزِ عمل پر نگاہ رکھیں گے۔ پھر عنقریب ہی غائب و حاضر سب کے جاننے والے کے حضور تمہاری پیشی ہوگی اور وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔ اور کچھ اور بھی ہیں جن کا معاملہ اللہ کے فیصلے تک ملتوی کیا جاتا ہے۔ وہ یا تو ان کو سزا دے گا، یا اُن کی توبہ قبول فرمالے گا۔ اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے!"

مومنین صادقین اور منافقین کے بین بین کے جن لوگوں کا ذکر ان آیاتِ مبارکہ میں وارد ہوا ہے۔ قرآن حکیم نے تو اگرچہ انہیں کسی مخصوص نام سے موسوم نہیں کیا لیکن ان کے جن حالات و کیفیات کا ذکر یہاں ہوا ہے۔ ان کے پیشِ نظر انہیں "ضعفاء" کے نام سے موسوم کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ لوگ اگرچہ سچے بھی تھے اور مخلص بھی لیکن انہیں "ضعفِ ارادہ" کا مرض لاحق تھا۔ اور ان کے اس نفسیاتی کمزور اور عملی تساہل کے باعث نفس اور شیطان یعنی دونوں کو وسوسہ اندازی کا موقع مل جاتا تھا۔ چنانچہ کبھی یہ ترغیباتِ نفسانی کے زیرِ اثر کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے تھے، اور کبھی جہاد و قتال اور انفاق فی سبیل اللہ کے مواقع پر تذبذب کا شکار ہو جاتے تھے اور اس طرح گویا بظاہر احوال اُن کا طرزِ عمل منافقین کے مشابہ ہو جاتا تھا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اُن کے اندر ایمان کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھتی تھی، اور یہ راسخ الایمان لوگوں کے شانہ بشانہ اقامتِ دین کی جدّوجہد اور اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی میں پوری سرفروشی و جانفشانی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان کے ضمن میں نہایت سلیس لیکن حد درجہ فصیح الفاظ استعمال فرمائے کہ: خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ط یعنی انہوں نے کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں دونوں ساتھ ساتھ کمائی ہیں، اور اپنی شخصیتوں میں خیر اور شر اور اپنے نامۂ اعمال میں بِرّ و اثم کو گڈمڈ کر دیا ہے ——!!

البتہ جو چیز انہیں منافقوں سے ممیّز کر دیتی ہے وہ ان کی جانب سے "اعترافِ تقصیر" ہے۔ یہ نکتہ اہم ہے اس لئے کہ ظاہر و باطن دونوں اعتبارات سے ضعفِ

ایمان اور نفاق کی سرحدیں بالکل "مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد" کے مصداق ایک دوسرے سے بالکل متصل ہیں۔ لہٰذا اُن کے مابین حدِ فاصل کی تعیین بہت ضروری ہے، اور وہی حدِ فاصل ہے جو یہاں "اِعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ" کے الفاظ میں وارد ہوئی۔ یعنی وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر جھوٹے بہانوں کے پردے نہیں ڈالتے۔ اپنی لغزشوں کی خوشنما توجیہات نہیں کرتے، اپنی تقصیروں کے لئے عذراتِ لنگ نہیں تراشتے بلکہ صاف اقرار کر لیتے ہیں کہ ہم سے خطا ہوئی اور کمزوری کا اظہار ہوا۔ جس کے لئے ہم عفو و درگذر کے خواستگار ہیں۔ آیاتِ زیرِ درس ایسے لوگوں کے حق میں نویدِ جانفزا اور نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔ اس لئے کہ شہنشاہِ ارض و سموات نے انہیں بھرپور امید دلائی ہے کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے گی اور انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ کلمۂ "عسیٰ" اصلاً تو عربی میں 'شاید' کے مفہوم کا حامل ہے۔ لیکن جب یہ شاہانہ انداز کلام کے ضمن میں آتا ہے۔ تو اس میں حتمی وعدے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے ـــــ !!

آگے ان ضعفاء کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اہم ہدایات دی گئی ہیں: (۱) اوّلین اور اہم ترین یہ کہ ان کے اموال میں سے زکوٰۃ و صدقات وصول فرمالیں۔ واضح رہے کہ اسی سورۂ مبارکہ کی آیات ۵۳، ۵۴ میں بیان ہو چکا ہے کہ منافقین کا صدقہ و انفاق مقبول نہیں، مردود ہے، اس لئے کہ انہوں نے اسے اپنے نفاق اور کفر کے لئے پردہ اور اوٹ بنا لیا ہے:

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

یعنی "کہ دیجئے (اے نبیؐ) کہ خواہ تم دلی آمادگی سے انفاق کرو، خواہ مارے باندھے کرو، یہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اس لئے کہ تم (ایمان کی) حدود سے نکل چکے ہو!"

اس کے برعکس ہے معاملہ ضعفاء کا۔ ان کے ضمن میں تاکیدی حکم ہو رہا ہے کہ ان سے زکوٰۃ و صدقات وصول کریں اور ساتھ ہی اس کی حکمت بیان کی جا رہی ہے کہ اس طرح ان کی تطہیر بھی ہوگی اور تزکیہ بھی۔ تطہیر کے معنی نجاست اور گندگی سے نجات پانا ہے اور تزکیہ اس کا نتیجہ ہے یعنی نشوونما کے فطری عمل میں افزونی اور اضافہ۔ دین کے راستے میں انسان سے جس کمزوری کا اظہار ہوتا ہے، اُس کا آخری سبب حُبِّ عاجلہ

ہی ہوتی ہے۔ یعنی دُنیا اور اُس کے مال و منال کی محبّت۔ چنانچہ یہی نجاست ہے جو زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے دُھل جاتی ہے۔ نتیجۃً قلبِ انسانی از سرِ نَو صاف و شفّاف ہو جاتا ہے اور اس میں انوارِ ایمانی پھر پوری شدّت کے ساتھ منعکس ہو جاتے ہیں، اور انسان بِرّ و تقویٰ، ایمان و احسان اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی راہ پر دوبارہ عزم و ہمّت کے ساتھ گامزن ہو جاتا ہے۔ اسی عمل یا PHENOMENON کا نام "تزکیہ" ہے۔ (۲) دوسرا حکم آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ ملا کہ ان ضعفاء کے حق میں دعا کیجئے۔ یہ معاملہ بھی منافقین کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے بارے میں آیت ۸۴ میں یہ حکم وارد ہو چکا ہے کہ: "نہ آپ ان میں سے کسی کی موت پر دعا کریں یعنی نمازِ جنازہ ادا فرمائیں نہ ان میں سے کسی کی قبر پر تشریف لے جائیں"۔ اس لئے کہ اگرچہ قانونی اعتبار سے منافق مسلمان ہی شمار ہوتا ہے اور قانونی اسلام ہی کی حالت میں اس کی موت واقع ہوتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ کفر پر مرتا ہے۔ اس کے برعکس ہے معاملہ ضعفاء کا کہ اگرچہ بظاہر ان کا طرزِ عمل منافقین کے مشابہ ہو جاتا ہے، لیکن باطن کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے اس لئے کہ اُن کی نیّت میں فتور نہیں ہوتا اور ان کے دل میں ایمان موجود ہوتا ہے۔ اس دُعائے رسولؐ کی حکمت بھی واضح فرمادی کہ: "اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ"۔ یعنی آپؐ کی دُعا اُن کے لئے وجہِ تسکین ہے، اور اس کے ذریعے ان کو تثبیتِ قلبی حاصل ہو گی، اور ان کا وہ ایمان جو کبھی کبھی متزلزل ہو جاتا ہے از سرِ نَو راسخ و متمکّن ہو جائے گا ـــــ آیت ۱۰۴ میں وضاحت فرمادی کہ خواہ زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی قبولیّت کا مسئلہ ہو، خواہ رسولؐ کی دُعا ـــــ یہ سب اللہ ہی کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کے مظاہر ہیں ؛

آیت ۱۰۵ میں ذرا تنبیہی انداز اختیار فرمایا گیا کہ اللہ کے اس فضل و کرم اور اس کی شانِ غفّاری و ستّاری اور رحیمی و کریمی سے دھوکا کھا کر عمل سے بے پروا مت ہو جانا۔ اصل فیصلہ کن چیز تمہارا آئندہ کا طرزِ عمل ہے: "اِعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۚ" (عمل کرو۔ اللہ بھی تمہارے عمل کو دیکھے گا اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان بھی دیکھیں گے!) تمہارا

عمل بتائے گا کہ تم نے اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوئی کوشش کی یا نہیں اور تلافیٔ مافات کی کوئی سعی کی یا نہیں ـــــ گویا اللہ کے عفو و درگذر، اور رحم و کرم کی کوئی قدر کی یا نہیں ـــ !!

آخر میں یہ مشفقانہ اور مُربّیانہ تہدید نہایت شدید ہو گئی کہ دُنیا والوں کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے، لیکن آخری اور فیصلہ کُن سابقہ تو پیش آنے والا ہے اُس ذات سے جو ہر کھُلے اور چھُپے، اور ظاہر و غائب کی جاننے والی ہے : لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ط (نہیں مخفی اللہ سے کوئی بھی چیز خواہ زمین میں ہو خواہ آسمان میں!) پھر وہ تمہارا سارا کیا دھرا تمہارے سامنے رکھ دے گا ـــ !!

آیت ۱۰۶ میں بعض معیّن حضرات کا ذکر ہے جن کے معاملے کو قدرے مؤخّر کر دیا گیا، اور مغفرت کی واضح بشارت کے بجائے ان کو فی الحال "بین الخوف والرّجاء" معلّق کر دیا گیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سزا دی جائے۔ ان حضرات کی توبہ کی قبولیّت کا واشگاف اعلان بعد میں آیت ۱۱۸ میں وارد ہوا۔ لہٰذا ان حضرات کا تفصیلی ذکر اسی آیۂ مبارکہ کے ذیل میں ہو گا ؂

یہاں اس قدر جان لینا چاہیئے کہ جیسے مومنینِ صادقین کے بہت سے مراتب و مدارج ہیں، اور اسی طرح نفاق کے بھی بہت سے مدارج ہیں۔ بالکل اسی طرح "ضعفاء" میں بھی بہت فرقِ مراتب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کا سب سے نچلا درجہ وہ ہے جو سورۂ حجرات کی آیت ۱۴ میں بیان ہوا، جس میں ایمان کی کلّی نفی کے ساتھ صرف اسلام کا اثبات ہے۔ لیکن ساتھ ہی نفاق کی بھی نفی ہے۔ اس لئے ان کی اطاعت کو شرفِ قبول عطا فرمایا گیا ہے۔ جب کہ منافقین کا کوئی عمل بھی مقبول نہیں ہو سکتا، گویا کہ یہ تو قانونی اسلام کی وہ صورت ہے جس میں دل میں نہ تو مثبت طور پر ایمان ہی متحقق ہے نہ منفی طور پر نفاق ـــ بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بالکل دوسری انتہاء پر وہ لوگ ہوں گے جن سے صرف کبھی کبھار کوئی کوتاہی ہو جاتی ہو، ورنہ اکثر و بیشتر ان کا طرزِ عمل بالکل وہی ہو جو مومنینِ صادقین کا ہونا چاہیئے۔ ایسے لوگوں کی کوتاہیوں پر بظاہر عتاب زیادہ شدید ہوتا ہے۔ گویا کہ انہیں بھرپور طور پر احساس دلایا جاتا ہے کہ تم اور یہ تقصیر ؟ ـــ !!

آیت ۱۰۶ میں دراصل اسی قسم کے لوگوں کا ذکر ہے ـــ اور ان دونوں کے

بین بین ہیں اکثر ضعفاء ـــــ جن کی کثرت تعداد ہی کے باعث ان کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ ہوا پوری چار آیات میں یعنی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۵ ـــــ !!!

اللہ تعالیٰ ہمیں نفاق اور ضعفِ ایمان کی ان تمام کیفیات سے بچائے ـــ اور مومنینِ صادقین کے زمرہ میں شامل فرمائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین !

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

---

(۴)

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا
ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی
مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ
وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ
اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ
فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا
یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۱۰﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۰۷ تا ۱۱۰ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس لئے کہ (اسلام کو) نقصان پہنچائیں اور کفر کی تقویت کا ذریعہ بنیں اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور کمین گاہ فراہم کریں، ان کے لئے جو پہلے ہی اللہ اور اُس کے رسول سے (علانیہ) جنگ کر چکے ہیں۔ وہ لازماً قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ سوائے بھلائی کے اور کچھ نہ تھا، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں (اے

نبی !) آپ اس میں کبھی کھڑے ہونا بھی گوارا نہ فرمائیں۔ وہ مسجد کہ جس کی بنیاد اوّل روز سے تقویٰ پر رکھی گئی تھی، زیادہ حقدار ہے کہ آپ اُس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو بہت ہی عزیز رکھتے ہیں، اور اللہ انہیں عزیز رکھتا ہے جو پاکیزگی سے شدید لگاؤ رکھتے ہیں۔ (ذرا سوچو !) کیا وہ شخص بہتر ہوگا جس نے اپنی عمارت کی اساس اللہ کے تقویٰ اور رضا جوئی پر رکھی یا وہ جس نے اپنی عمارت کی اساس کسی ایسے کنارے پر رکھی جو نیچے سے کھوکھلا ہو چکا تھا، اور بس گرا ہی چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اس کے سمیت جہنم کی آگ میں جا گرا۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے اب ہمیشہ کے لئے ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بن کر جمی رہے گی (جس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی) سوائے اس کے کہ اُن کے دل ہی پاش پاش ہو جائیں اور اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا !"

اِن آیاتِ مبارکہ میں منافقینِ مدینہ کی ایک نہایت عیّارانہ سازش کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ اُنہوں نے اپنی مذموم سرگرمیوں کے لئے ایک اڈّا اور اپنے باہمی رابطے کے لئے ایک مرکز تعمیر کیا لیکن اُسے نام مسجد کا دیا تاکہ کسی کے لئے اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نام نہاد مسجد مدینہ منوّرہ کے نواح میں کہیں مسجدِ قبا کے آس پاس تعمیر کی گئی ہوگی۔ اس لئے کہ مدینے کے مرکز میں تو مسجدِ نبوی موجود تھی جو ایمان و اسلام کا مرکز بھی تھی اور بِرّ و تقویٰ کا گہوارہ بھی، اور اہلِ ایمان کی محبتوں اور عقیدتوں کا مرجع بھی تھی اور اُن کے جملہ اجتماعی معاملات کے طے پانے کا مقام بھی۔ گویا وہی اس اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ بھی تھی، اور گورنمنٹ ہاؤس بھی ـــــ اور ظاہر ہے کہ وہاں منافقوں کے لئے کسی بھی درجے میں عمل دخل کا حصول ممکن نہ تھا، اور وہاں ان کی کچھ پیش نہ جا سکتی تھی۔ چار و ناچار انہوں نے ابو عامر راہب کے مشورے سے طے کیا کہ نواحِ مدینہ میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائیں تاکہ وہ اُن کے باہمی رابطے کا مرکز بھی بن سکے اور اِدھر اُدھر سے آنے والے دشمنانِ ایمان و اسلام کی خفیہ قیام گاہ کا کام بھی دے سکے۔ اب ظاہر ہے کہ اگرچہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور مومنین صادقین کی نگاہ حقیقت بیں سے ان کے اصل عزائم مخفی نہ تھے، تاہم چونکہ وہ قانوناً بہ حال مسلمان تھے، اور اپنی اس عمارت کو بھی انہوں نے ظاہری صورت مسجد ہی کی دی تھی لہٰذا اُن کے خلاف کوئی فوری اقدام مناسب نہ تھا۔ البتہ جب انہوں نے اپنی عیّاری

کو دو آتشہ بنانے کی غرض سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہ درخواست بھی کی کہ ایک بار آپؐ وہاں نماز پڑھا کر گویا اس کا افتتاح بہ نفسِ نفیس فرما دیں تو آنحضورؐ نے بہ لطائف حیل ان کو ٹال دیا کہ فی الحال میں غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں مصروف ہوں وہاں سے واپس آکر دیکھا جائے گا۔ گویا آپ منتظر تھے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اُن کی سازش کا پردہ چاک فرما دے، اور اُن کی اصل حقیقت واشگاف فرما دے۔ تاکہ اُن کے خلاف اقدام کیا جا سکے۔ چنانچہ یہی وہ مقصد ہے جو سفرِ تبوک سے واپسی کے دوران اِن آیاتِ مبارکہ کے نزول سے پورا ہوگیا۔ نتیجۃً آپ نے واپس مدینہ پہنچ کر جو پہلا کام کیا وہ یہی تھا کہ اس نام نہاد مسجد کو گرا دیا گیا، اور بعد میں ہمیشہ کے لئے اسلامی ادب میں "مسجدِ ضرار" ایک اصطلاح بن گئی ہر سازشی اڈے اور تخریبی مرکز کے لئے! ؛

"ضرار"۔ ضرر سے بابِ مفاعلہ ہے، جس سے بغض و عناد اور عداوت و دشمنی میں مبالغے کی کیفیت بھی سامنے آتی ہے اور ضد اور ہٹ دھرمی کی بھی۔ گویا اس ایک لفظ میں نفاق کی تمام ظاہری اور باطنی کیفیات کو جمع کر لیا گیا ہے ؛

قرآنِ حکیم میں منافقوں کا سب سے بڑا اور نمایاں وصف یہی بیان ہوا ہے کہ وہ جھوٹ بولنے میں نہایت بے باک ہوتے ہیں۔ حتّٰی کہ جھوٹی قسمیں کھانے میں بھی بہت جری ہوتے ہیں۔ سورۂ منافقون میں فرمایا گیا: "اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً"! (انہوں نے قسموں کو اپنے لئے ڈھال بنا لیا ہے!) اور جب بھی باز پرس ہوتی ہے تو جھوٹی قسمیں کھا کر چھوٹنے کی سعی و جُہد کرتے ہیں۔ وہی بات یہاں بھی بیان ہوئی کہ اس "مسجدِ ضرار" کی تعمیر پر بھی وہ تو قسمیں کھا کر یہی کہیں گے کہ ہماری نیّت نیک تھی اور سوائے خیر و صلاح کے ہمیں اور کچھ مطلوب نہ تھا۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ واضح رہے کہ حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام میں بھی منافقین کی اوّلین اور نمایاں ترین علامت کذب بیانی اور دروغ گوئی ہی کو قرار دیا گیا ہے۔

آیت ۱۰۸ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے طرزِ عمل کی توثیق وارد ہوئی کہ اس نام نہاد مسجد میں آپؐ کا تشریف لے جانا ہرگز مناسب نہ ہوتا۔ اوّل تو آپؐ کا اصل مرکز آپؐ کی اپنی مسجد ہے ہی اور اگر فاصلے کا عذر ہو تو نواحِ مدینہ میں مسجدِ قبا موجود ہے جس کی اساس اوّل روز سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اور جس میں وہ لوگ ہیں جنھیں صفائی

اور پاکیزگی انتہائی عزیز ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ اہلِ قُبا سے جب لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی صفائی و پاکیزگی سے محبت و الفت کا اس قدر شدّ و مدّ سے ذکر فرمایا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ حوائجِ ضروریہ سے فراغت کے بعد پہلے مٹّی کے ڈھیلوں سے اِستنجا کرتے ہیں اور پھر پانی سے بھی طہارت حاصل کرتے ہیں ـــــ بہرنوع آنحضورؐ سے فرمایا گیا کہ اگر آپؐ کا اُدھر سے گذر ہو ہی جائے تو مسجد قبا اصل حقدار ہے اس کی کہ آپؐ اس میں رونق افروز ہوں نہ کہ یہ نام نہاد مسجدِ ضرار ـــــ !!

آیات ۱۰۹، ۱۱۰ میں ایک عجیب حقیقت پہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور وہ یہ کہ ہر عمارت جو اس زمین پر بنتی ہے، اس کی بنیادیں دو ہوتی ہیں: ایک ظاہری اور مادّی بنیاد جو زمین پر یا اس میں قائم ہوتی ہے اور اینٹ گارے ایسی مادّی چیزوں سے بنی ہوتی ہے اور دوسری فکری یا نظریاتی بنیاد، جو اس تعمیر کے اٹھانے والوں کے دلوں اور ذہنوں میں ہوتی ہے ـــــ اور ان کی نیتوں اور ارادوں ـــــ اور عزائم و مقاصد پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ بندۂ مومن کی ہر تعمیر کی اصل اساس اللہ کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی و رضا جوئی کے نصب العین پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا ظاہری و مادّی اعتبار سے سادگی کے باوصف اسے دوام و بقا نصیب ہوتا ہے، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات و دوام ❊ جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام!

اس کی اعلیٰ ترین اور نمایاں ترین مثال خانہ کعبہ کی تعمیر ہے جسے اُس کے مقدّس معماروں یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیٰ نبیّنا وعلیہما الصّلوٰۃ والسّلام نے جن ارادوں اور اُمنگوں سے اُٹھایا وہ اُن کی اُس دُعا سے ظاہر ہے جو اُس کی تعمیر کے وقت اُن کے دلوں کی گہرائیوں سے اُبھر کر اُن کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھی:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ

إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (البقرہ آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹)

اس کے برعکس کفّار و منافقین کی تعمیر خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مضبوط اور شاندار کیوں نہ ہو ان کے نظریات و عقائد کی بے اصلی اور ان کے مقاصد و عزائم کی بے ثباتی کی بنا پر عالمِ حقیقت میں ایک ایسے گھروندے کے مانند ہے جس کی بنیاد کسی ندّی نالے کے ایسے کھوکھلے کنارے پر رکھ دی گئی ہو، جس کے نیچے سے پانی کے بہاؤ نے مٹّی نکال دی ہو اور اب وہ ایک معلّق کنگر سے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی عمارت پر خواہ کتنی ہی محنت کیوں نہ صرف کی گئی ہو اور کیسا ہی حسین رنگ و روغن اس پر کیوں نہ مل دیا گیا ہو اسے کوئی ثبات یا دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ وقت آنے پر وہ گرے گی، اور سیدھی جہنّم کی تہہ میں جا بیٹھے گی ؎

اور اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر حقیقت یہ کہ ایسی عمارتیں خواہ ظاہری اعتبار سے ڈھے بھی جائیں ان کی وہ جڑیں جو اُن کے تعمیر کرنے والوں کے دلوں اور ذہنوں میں ہوتی ہیں، جوں کی توں برقرار رہتی ہیں — بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کی جڑیں سرطان کے مانند ان کے قلوب و اذہان کے ریشے ریشے میں اس طرح پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کہ پھر ان کا نکالا کسی طرح ممکن ہی نہیں رہتا سوائے اس کے کہ ان کے دلوں ہی کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ بات ۹ھ میں اس وقت کہی جا رہی ہے جب نفاق کا مرض منافقین کے دلوں اور ذہنوں میں فی الواقع اسی کیفیت کے ساتھ سرایت کر چکا تھا اور اس کی جڑیں ان کی سیرتوں اور شخصیتوں میں اسی طور سے پیوست ہو چکی تھیں۔ جس کا نقشہ کھینچا گیا سورۂ منافقون کی اس آیت میں کہ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ یعنی — "یہ اس لئے کہ وہ ایمان تو لائے تھے لیکن پھر کفر میں مبتلا ہو گئے۔ نتیجۃً ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور اب وہ فہم و تفقّہ سے بالکل عاری ہو چکے ہیں!"

آخری الفاظ — یعنی "تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ!" میں صنعتِ لفظی اور حُسنِ معنوی کا ایک عجیب امتزاج پایا جاتا ہے۔ مزید برآں ان کے صوتی اثرات سے کیفیتِ تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے۔ منافقین کے اندازوں کے برعکس — اور اُن کی توقّعات کے علی الرّغم اللہ تعالیٰ نے جو روز افزوں ترقّی اسلام کو عطا فرمائی اور جس طرح قدم قدم پر فتح و کامیابی

نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کے قدم چومے اس سے منافقین کے دلوں پہ جو بیتی ہوگی اور رنج وغم کے جو پہاڑ ٹوٹے ہوں گے اُن کی حسین ترین تعبیر "تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ" میں جھلک رہی ہے۔ بالکل یہی انداز ہے سورۂ آلِ عمران میں وارد شدہ الفاظ "قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ" کا کہ اب تم اپنے غیظ و غضب اور بغض و عناد کی آگ میں خود ہی جل مرو اور ناکامی و نامرادی کے رنج و غم کی بھٹی میں آپ بھسم ہو جاؤ۔" اعاذنا اللہ من ذٰلک ، وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۵)

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۱ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :

"بے شک خرید لئے ہیں اللہ نے ایمان والوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے اموال اس قیمت پر کہ اُن کے لئے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، چنانچہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ وعدہ ہو چکا اس کے ذمے سچا، تورات میں بھی، انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی! اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے! پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے، اور واقعہ یہ ہے، بڑی کامیابی یہی ہے!"

یہ آیۂ مبارکہ بلا شبہ قرآنِ حکیم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ قرآن کے اعجاز کا کمال یہ ہے کہ وہ اعلیٰ ترین علمی حقائق کو نہایت سادہ الفاظ میں پیش کرتا ہے اور عامۃ النّاس سے بالکل اُن کی ذہنی سطح کے مطابق کلام فرماتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسا کوئی انسان نہیں ہو سکتا جو تجارت و کاروبار، بیع و شرا اور خرید و فروخت ایسے معاملات کو نہ سمجھتا ہو اور کوئی عامی سے عامی انسان بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ نہ جانتا ہو کہ جہاں کچھ لینا مقصود ہو وہاں

کچھ دینا بھی پڑتا ہے — اور تجارت سے اگر نفع مقصود ہو تو کچھ نہ کچھ سرمایہ بھی لگانا پڑتا ہے اور پھر جسم و جان کی محنتیں اور صلاحیتیں بھی صرف کرنی پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں عبد و معبود کے مابین دوطرفہ معاملات کے باطنی و قلبی پہلوؤں یعنی محبت و انابت، صبر و شکر، تسلیم و رضا وغیرہ کی وضاحت کے لئے لطیف پیرایہ ہائے بیان اختیار کئے ہیں وہاں اس کے ظاہری اور عملی پہلوؤں کی تعبیر کے لئے تجارت اور بیع و شرا کی آسان اور جانی پہچانی تشبیہوں کو ذریعہ بنایا ہے ؛

اللہ اور آخرت پر ایمان کا اصل حاصل یہی ہے کہ انسان اُخروی نجات اور فوز و فلاح کے حصول یعنی جہنم سے چھٹکارا پانے اور جنت میں داخلہ حاصل کرنے کے لئے اس دنیا میں اپنا جسم و جان اور مال و منال سب اللہ کے حوالے کر دے، اور پھر اس کی جانب سے ان سب کا امین بن کر اُن میں اس کی مرضی کے مطابق تصرّف کرے اور جہاں اس کا اشارہ پائے انہیں صرف کر کے سرخرو ہو جائے۔ گویا یہ ایک نہایت وسیع اور ہمہ جہتی معاملہ ہے۔ ایمان کے بعد انسان اپنے جسم و جان اور مال و منال میں جو تصرّف کرتا ہے اس کا مالکِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہونا لازمی ہے، ورنہ ایک خیانت تصوّر ہو گی بقول شیخ سعدیؒ : ؎

"ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست ؛ درحقیقت مالکِ ہر شے خداست !"

چنانچہ انسان جو لقمہ بھی خود اپنے یا اپنے اہل و عیال کے مُنہ میں ڈالتا ہے وہ بھی دراصل اذنِ ربّ کے تحت ہے بمصداقِ فرمانِ نبویؐ : "وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا"...... (الحدیث) یعنی تم پر تمہارے نفس کا بھی حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، وقس علیٰ ذٰلك۔ تاہم اس معاملے میں ایمان کا اصل تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے جسم و جان اور مال و منال کا صرف قدرِ قلیل اپنے اور اپنے اہل و عیال کی قوتِ لایموت کے لئے مختص کرنے کے بعد باقی جو بھی بچے اسے ہر دم اللہ اور اس کے دین کے لئے صرف کرتا رہے بمصداقِ الفاظِ قرآنی : "وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ؕ" یعنی (اے نبی !) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا کچھ صرف کریں کہہ دیجئے کہ جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو — اور اس کا نقطۂ عروج (CLIMAX) یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو تو انسان گھربار، مال و منال اور اہل و عیال سب سے

منہ موڑ کر نقد جان ہتھیلی پر رکھے اور قتال فی سبیل اللہ کے لئے میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے اور اگر اللہ تعالیٰ جان کا نذرانہ قبول فرمالے تو اسے سب سے بڑی کامیابی اور سعادت سمجھے ورنہ منتظر رہے کہ کب وہ وقت آئے کہ وہ جان کا نذرانہ پیش کر کے سرخرو اور گردن کٹا کر سبکدوش ہو جائے۔ بقولِ الفاظِ قرآنی :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	(یعنی) "اہلِ ایمان میں وہ جوانمرد ہیں جنھوں
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ	نے پورا کر دکھایا وہ عہد جو انھوں نے اللہ سے
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ	کیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنا
يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝	نذرانہ پیش کر چکے ہیں، اور وہ بھی ہیں جو اس کے
	انتظار کر رہے ہیں۔ بہر حال انھوں نے (اپنے معاہدے میں) سرِ مُو کوئی تبدیلی نہیں کی!"

یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم از کم دو مقامات پر ضرور وارد ہوتے ہیں اور ہر اہم آیت کا کوئی نہ کوئی مثنّیٰ ضرور ہوتا ہے۔ اس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر نظر دوڑائی جائے تو اس آیۂ مبارکہ کا مثنّیٰ سورۂ صف کی آیات ۱۰، ۱۱ میں ملتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ یہاں بیع و شراء کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور وہاں لفظ تجارت وارد ہوا ہے۔ یہاں کامیابی کی آخری منزل یعنی حصولِ جنّت کا ذکر ہے۔ وہاں اس کے ابتدائی مرحلے یعنی جہنّم سے نجات پانے کی بات ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح وارد ہوئی ہے اور یہاں اس کی بلند ترین چوٹی ذروۂ سنام، قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ	(یعنی) اے اہلِ ایمان! کیا میں تمھاری رہنمائی
عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ	کروں اس تجارت کی جانب جو تمھیں عذابِ
اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان رکھو اللہ
وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ	پر اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اس کی
وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ	راہ میں اپنی جانوں اور اپنے اموال کے ساتھ،
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	یہی بہتر ہے تمھارے حق میں اگر تم واقعی صاحبِ
	علم و فہم ہو!

مزید غور کیا جائے تو یہی مضمون سورۂ حدید میں ایک بلند تر سطح پر وارد ہوا ہے چنانچہ

وہاں تجارت اور بیع و شراء کے عام فہم الفاظ کے بجائے فلسفہ و حکمتِ قرآنی کی ایک نہایت اہم اصطلاح یعنی "خلافتِ انسانی" کے حوالے سے بات کی گئی ہے، سورۂ حدید کی ابتدائی چند آیات میں ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کا ذکر نہایت رفعتِ شان کے ساتھ اعلیٰ ترین علمی سطح پر ہوا ہے اور اس کے بعد ساتویں آیت میں ایمان باللہ کے عملی تقاضوں کو حد درجہ جامعیت اور کمالِ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ایک آیت میں بایں الفاظ سمو دیا گیا کہ:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ	(یعنی) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور کھپاؤ اور صرف کرو ان تمام چیزوں میں سے جن میں اُس نے تمہیں خلافت کا حامل بنا دیا ہے!

اور پھر آتا ہے اسی وعدۂ ربّانی کا ذکر جو آیتِ زیرِ درس میں نہایت مؤکّد و مکرّر صورت میں وارد ہوا ہے ــ یعنی: "فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝" (یعنی جو ایمان لے آئیں اور اس کے عملی تقاضے یعنی انفاقِ مال اور بذلِ نفس سے عہدہ برآ ہو جائیں اُن کے لئے بہت بڑا اجر و ثواب ہے!) ــ آیتِ زیرِ درس میں اس ضمن میں جو تاکید آئی ہے یعنی یہ کہ یہ وعدہ برحق ہے، اس کا ذمّہ دار اللہ ہے، یہ تورات اور انجیل اور قرآن تینوں کتابوں میں وارد ہوا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کا پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے، تو اس کا سبب یہ ہے کہ بندے اور ربّ کے مابین یہ بیع و شرا نقد نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت گویا بیع سَلَم کی ہے جس میں ایک فریق کی جانب سے مکمّل ادائیگی فوری طور پر ہو جاتی ہے اور دوسرے فریق کی جانب سے اس کے معاوضے کی ادائیگی ایک وقتِ معیّن کے لئے مؤخّر ہوتی ہے۔ اس میں ظاہر ہے کہ دار و مدار فریقِ ثانی کے قابلِ اعتماد ہونے کے یقین پر ہے، اور اس کا براہِ راست تعلّق خود نفسِ ایمان سے ہے۔ گویا جتنا جتنا ایمان بڑھتا چلا جائے گا اُتنا ہی اللہ کی ذات پر اعتماد اور: "اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ!" پر یقین میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اتنی ہی اللہ کے ساتھ اس بیع و شراء میں شدّت بھی بڑھتی چلی جائے گی اور اس میں مزید نکھار آتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ انسان "نقدِ جان" کے عوض آخرت کی "حیاتِ دوام" کا سودا چکانے میں کوئی باک محسوس نہ کرے گا، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ	(یعنی) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں

اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ — انہیں مردہ مت کہو۔ حقیقتاً وہ زندہ ہیں اگرچہ تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں!"

اور بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

"برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ٭ ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی!"

آگے اس یقین کا نتیجہ سامنے آتا ہے "استبشار" یعنی خوشی منانا یا خوشخبری حاصل کرنا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اصل کسوٹی ہے انسان کے خلوص یا عدمِ خلوص کی۔ اگر اللہ کے ساتھ اس سودے سے انشراحِ صدر اور انبساطِ قلب کی کیفیت حاصل ہو تو یہ دلیل ہے یقینِ واقعی اور ایمانِ حقیقی کی اور ثبوت ہے جہاد و قتال فی سبیل اللہ اور اللہ کی راہ میں انفاقِ مال اور بذلِ نفس کے مبنی بر خلوص و اخلاص ہونے کا۔ جیسے کہ بالکل بے ساختہ الفاظ نکلے تھے حضرت خبیبؓ بن عدی کی زبان سے جب کفار اُن کو شہید کرنے کے درپے تھے اور نیزے کی انی اُن کے جگر میں چبھوئی گئی تھی کہ: "فُزْتُ وَ رَبِّ الْکَعْبَۃِ" یعنی — ربِّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا!" — کاش کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اسی ایمان و یقین اور خلوص و اخلاص کی کوئی رمق عطا فرما دے ع: "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!"

آیت کے آخری حصے میں وارد شدہ الفاظِ مبارکہ: "بِبَیْعِکُمُ" اور "بَایَعْتُمْ بِہٖ" ہی سے نظامِ دین کی ایک اہم اصطلاح "بیعت" نکلی ہے، جو بدقسمتی سے اس دور میں بہت حد تک نہ صرف متروک بلکہ بدنام بھی ہو گئی ہے۔ حالانکہ قرآن اور حدیث کی اصل اصطلاح بھی یہی ہے، سیرت النبیؐ میں بھی یہ لفظ بار بار وارد ہوا ہے اور اسی پر بعد میں نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ اُستوار ہوا تھا۔ یہاں تک تو یہ اصطلاح اپنے پورے مفہوم کے ساتھ رہی لیکن بعد میں جب مسلمانوں کی سیاسی و دینی قیادت منقسم ہو گئی تو پھر اس کا استعمال محدود مفہوم میں صرف "بیعتِ ارشاد" کے لئے ہونے لگا۔ اب ضرورت ہے کہ دوبارہ اس اصل ثابت کی جانب رجوع کیا جائے اور مسلمان اپنی جملہ اجتماعی و تنظیمی ہیئتیں اسی پر اُستوار کریں — یہ بھی واضح رہے کہ اللہ کے ساتھ یہ بیع و شراء اگرچہ بندے اور ربّ کے مابین خالص نجی معاملہ ہے لیکن عالمِ واقعہ میں اس کی صورت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا آپؐ کے نائبین میں سے کسی کے ہاتھ پر "بیعت" ہی کی ہو گی جیسے کہ ارشاد ہوا سورۂ فتح کی آیت ۱۰ میں "بیعتِ رضوان" کے ضمن میں کہ:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ ط يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ

(یعنی - اے نبیؐ!) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں اصل میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں- اُن کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے! (رضی اللّٰہ عنہم و رضوا عنہ)

اللّٰھم ربّنا اجعلنا منھم ـــــ آمین ثم آمین ـــــ!!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(٦)

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۲ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"اللہ کی طرف پلٹنے والے، اُس کی بندگی کا حق ادا کرنے والے، شکر و ثناء میں مشغول رہنے والے، اُس کے لئے سب سے مُنہ موڑ لینے والے، رکوع و سجود میں مشغول رہنے والے نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حُدود کی حفاظت کرنے والے اور (اے نبیؐ!) ایسے اہلِ ایمان کو خوشخبری سُنا دیجئے!"

اس آیۂ مبارکہ کے مفہوم کی تعیین میں ایک اشکال ہے[1] اور وہ یہ کہ اس کا آخری ٹکڑا یعنی "بشّرِ المومنین" تو کلامِ انشائیہ پر مشتمل ہے اور ایک مکمّل جُملہ ہے جو ماسبق سے حرفِ عطف 'واؤ' کے ذریعے جڑا ہوا ہے لیکن پہلا اور بڑا حصّہ بہت سے اسمائے صفات پر مشتمل ہے جنہیں اگر مبتداء قرار دیا جائے تو خبر کو محذوف ماننا پڑتا ہے[2]۔ خالص قواعد کی رُو سے یہ دونوں صورتیں یکساں ممکن ہیں- چنانچہ بعض حضرات نے اسے مبتدا مانا ہے اور خبر کو محذوف قرار دیا ہے- گویا ان کے نزدیک تالیفِ کلام یوں ہے کہ ان صفات کے حامل لوگ ہی حقیقتاً مومن ہیں اور اے نبیؐ! آپ انہیں بشارت دیجئے! یہ تعبیر بھی بجائے خود نہایت اعلیٰ ہے اور اس معنی میں یہ آیت سورۂ انفال کی آیات ۲ تا ۴ کا مثنّٰی بن جائے گی، جہاں ایمانِ حقیقی کے ایسے ہی ثمرات و لوازم کے ذکر کے بعد فرمایا گیا کہ: "اُولٰٓئِكَ

[2] اور اگر خبر قرار دیا جائے تو مبتدا محذوف ماننا پڑتا ہے۔

هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّاؕ یعنی "یہی لوگ حقیقتاً مومن ہیں!"۔ لیکن اکثر حضرات کے نزدیک یہاں مبتدا محذوف ہے اور مذکورہ صفاتِ حسنہ سب اُس کی خبر ہیں اور کلام کی تالیف گویا یوں ہے کہ : اُولٰٓئِكَ هُمُ التَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ ..... الخ (یعنی یہی لوگ ہیں توبہ کرنے والے، عبادت کا حق ادا کرنے والے، حمد کے ترانے الاپنے والے ..... الخ)۔ یہ تعبیر اس اعتبار سے نہایت وقیع ہے کہ اس طرح اس آیتِ مبارکہ کا ایک نہایت گہرا اور معنی خیز ربط و تعلق آیتِ سابقہ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے — اور اس ربط و تعلق سے فلسفہ و حکمتِ دین کا وہ پہلو سامنے آتا ہے جو نہایت اہم اور اساسی ہونے کے باوجود اکثر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں نہایت یک رُخی شخصیتیں وجود میں آتی ہیں ؎

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دین اصلاً تو نام ہے عبد و معبود کے مابین ایک واقعی اور حقیقی تعلق کا۔ لیکن یہ تعلق یک رُخا نہیں بلکہ ہمہ پہلو اور ہمہ جہتی ہونا چاہیئے۔ یعنی علمی بھی اور عملی بھی، ظاہری بھی اور باطنی بھی، عقلی بھی اور جذباتی بھی، گویا ایک جانب انسان کے ایمان و یقین، عشق و محبت، توکل و اعتماد، صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی ذات بن جائے تو دوسری جانب اس کے جملہ اعضاء و جوارح بھی اسی کے ساتھ مشغول رہیں، چنانچہ زبان پر اسی کے ترانے جاری رہیں، ہاتھ پاؤں اسی کے احکام بجا لانے میں مصروف رہیں اور اس کا محبوبِ حقیقی اور اس کی کل سعی و جہد اور بھاگ دوڑ کا مطلوب و مقصودِ اصلی صرف اللہ بن جائے، اور انسان اس صبغۃ اللہ میں رنگ کر بالکل یک رنگ اور یکسو ہو جائے۔ لیکن اکثر و بیشتر عملاً یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے مزاج یک رُخے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کچھ فعّال، اور خارج پسند لوگ یعنی EXTROVERTS ہوتے ہیں جو عملی میدان میں تو خوب سرگرم رہتے ہیں لیکن باطنی کیفیات سے کم و بیش محروم رہ جاتے ہیں، جبکہ دوسرے لوگ دروں بین یعنی ENTEROVERTS ہوتے ہیں جو داخلی کیفیات میں اس درجہ مگن ہو جاتے ہیں کہ عملی تقاضے ادا ہونے سے رہ جاتے ہیں ——— !!

آیۂ ماسبق میں دین کے عملی پہلوؤں میں سے بھی چوٹی کا عمل نہایت شدّ و مد کے ساتھ مذکور ہوا تھا، یعنی : يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۝ یعنی "اللہ کی راہ میں جنگ کرنا، اور کفّار کو قتل کرنا اور خود بھی جامِ شہادت نوش کرنا!"— اِس

میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ہمارے دین میں چوٹی کا عمل یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں: "ذِرْوَةُ السَّنَام" بھی ہے، اور برّ و تقویٰ کے قرآنی تصوّر کی رُو سے خیرِ اعلیٰ یعنی HIGHEST VIRTUE یا SUMMUM BONUM بھی بجوائے الفاظِ قرآنی: (البقرہ: ۱۷۷)

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝	(یعنی) بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، تکلیف و اذیت میں اور جنگ و قتال میں، یہی ہیں درحقیقت سچے اور یہی ہیں فی الواقع متقی۔
یا :- اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصّف: ۴)	(یعنی) "اللہ تو محبت کرتا ہے ان سے جو اُس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر جنگ کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں!"

لیکن ظاہر ہے کہ یہ چوٹی کا عمل اسی شخص کی جانب سے قبول ہوگا جو ایک جانب عمل کے بھی دوسرے اساسی و بنیادی تقاضے ادا کر رہا ہو اور دوسری جانب اُس کا یہ سارا معاملہ عملی ہی عملی اور ظاہری ہی ظاہری نہ ہو بلکہ اُس کا باطن بھی ایمان سے منوّر ہو اور اُس کے قلب و ذہن میں ایمانی کیفیات و احساسات موجود ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بندۂ مومن کی مکمّل شخصیّت کی پوری تصویر کشی کے لئے آیۂ زیرِ درس میں ایمان کے باطنی ثمرات و لوازم کو بھی نمایاں کر دیا گیا اور اُس کے ظہورِ خارجی کے بھی بنیادی اور اساسی پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا گیا۔ تاکہ ان دونوں آیات کے مجموعے سے قرآن کے انسانِ مطلوب کا پورا کردار بیک وقت نگاہوں کے سامنے آجائے ؎

اس ضمن میں سب سے پہلا وصف توبہ ہے، جس کے معنی ہیں پلٹنا اور رجوع کرنا۔ اس معنی میں اس سے مراد کفر و شرک کو چھوڑ کر اوّلاً ایمان لانا بھی ہے ــــ اور گناہ و معصیت کو ترک کر کے تجدیدِ ایمان کرنا بھی۔ گویا توبہ اور ایمان لازم و ملزوم ہیں، جیسے فرمایا سورۃ الفرقان کی آیت ۷۰ میں: "اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا" یعنی: "سوائے اُس کے جس نے توبہ کی اور جو ایمان لایا یا جس نے ایمان کی تجدید کی اور عمل کیا اچھا!" ــــ الغرض توبہ ایمان و اسلام کے دائرے میں داخلے کا عنوان اوّلین بھی ہے اور سلوک کی راہ کا پہلا قدم بھی!ــ

دوسرا وصف عبادت ہے، جو بندگی اور پرستش دونوں کو محیط ہے' اور از رُوئے قرآن یہی غایتِ حیاتِ دُنیوی ہے، بلحوائے الفاظِ قرآنی: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ٥ — اور بقول شیخ سعدیؒ ؎

"زندگی آمد برائے بندگی ✧ زندگی بے بندگی شرمندگی!"

واضح رہے کہ عبادت کے قرآنی مفہوم میں دو اجزاء برابر کے شریک ہیں، ایک اللہ کی اطاعتِ کلّی اور دوسرے اس کی شدید محبّت — !!

تیسرا وصف حمد ہے، اور یہ بھی مجموعہ ہے شکر و ثناء اور تعریف و توصیف دونوں کا شکر کسی منعم و محسن کے ایسے انعام و احسان پر کیا جاتا ہے جس کا فیض شکر کرنے والے کی ذات کو براہِ راست پہنچے جبکہ تعریف و توصیف کسی بھی صاحب حسن و کمال کی کی جائے گی' خواہ اس کے حسن و کمال سے تعریف کرنے والے کی ذات کو کوئی براہِ راست فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔

چوتھا وصف سیاحت ہے، پرانے زمانے میں اس کا مفہوم تھا بن باس لے لینا اور اللہ سے لَو لگانے کی خاطر گھر بار' اہل و عیال، مال و منال اور آرام و آسائش سے بالکلیہ مُنہ موڑ کر جنگلوں میں نکل جانا اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا دَرّوں میں جا دھونی رمانا۔ اسلام میں اِس کی آخری شکل یعنی رہبانیت تو حرام کر دی گئی ہے' البتہ اس کی رُوح برقرار ہے اور اس کا ظہور روزہ و اعتکاف اور تحصیل علم دین یا تبلیغ و اشاعتِ دین اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے گھروں سے باہر نکلنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس کا خصوصی ذکر آگے آیت ۱۲۲ میں آ رہا ہے!

پانچویں اور چھٹے اوصاف رکوع و سجود ہیں جو عبارت ہیں نماز سے، جو از روئے فرمانِ نبویؐ دین کا ستون بھی ہے اور بندۂ مومن کی معراج بھی — اور اس میں بھی جہاں فرض نمازیں مراد ہیں وہاں نفلی نمازوں کی جانب بھی اشارہ موجود ہے۔

اسی طرح ساتویں اور آٹھویں اوصاف یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں یعنی نیکی کی اشاعت و تبلیغ، دعوت و تلقین اور جہاں ممکن ہو اس کی بالفعل ترویج و تنفیذ — اور بدی کی تردید و مذمت اور اس کے خلاف وعظ و نصیحت، اور اگر زور چلے تو اس کا بالجبر استیصال اور بیخ کنی — !!

نواں اور آخری وصف ہے حفاظتِ حدودِ الٰہی — اور یہ گویا ان جملہ اوصاف کا

لُبِّ لُباب بھی ہے اور ان سب کے گرد ایک حفاظتی فصیل کی حیثیت بھی رکھتا ہے، اور اس کے اوپر تو بس اب ایک ہی وصف اور ہے، اور وہ ہے جہاد و مجاہدہ فی سبیل اللہ جس کا ذروۂ سنام ہے قتال و مقاتلہ فی سبیل اللہ جس پر نہایت جامع اور عظیم الشان آیت آیۂ زیرِ درس سے متصلاً قبل وارد ہو چکی ہے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو اِن اوصافِ حسنہ کو بقدرِ ہمت و ظرف اپنی سیرتوں اور شخصیتوں میں جمع کرلیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ـــــ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(۷)

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى
مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ
اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ
عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ
قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ
وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۱۳ تا ۱۱۶ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

"نبیؐ اور مومنوں کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت طلب کریں خواہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ ان پر واضح ہو چکا کہ وہ جہنمی ہیں، اور ابراہیمؑ کی اپنے باپ کے حق میں مغفرت کی درخواست صرف اس وعدے کی وجہ سے تھی جو وہ اس سے کر چکا تھا۔ پھر جب اس پر بھی واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اُس سے اظہارِ بیزاری کر دیا۔ یقیناً ابراہیم بہت ہی رقیق القلب اور حلیم الطبع تھا۔ ـــــ اور کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد اس وقت تک گمراہ نہیں کرتا

جب تک کہ ان پر وہ سب کچھ واضح نہ کر دے جس سے انہیں بچنا ہے! بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ یقیناً اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے، اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حامی ہے نہ مددگار!" ———— صدق اللہُ العظیم !!

اللہ تعالیٰ اور اہلِ ایمان کے مابین جس کُلّی بیع و شراء کا ذکر آیت ۱۱۱ میں ہوا اور اُسی کی مناسبت سے اہل ایمان کے جن خصائص و اوصاف کا ذکر آیت ۱۱۲ میں ہوا ان سب کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی ہے کہ بندۂ مومن کی الفت و محبت اور نفرت و عداوت کا معیارِ واحد مرضیٔ مولا بن جائے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۂ فتح کی آخری آیت میں کہ: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" یعنی: "اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم!) اور اُن کے ساتھی (اہل ایمان) نہایت سخت ہیں کفّار کے حق میں اور حد درجہ رحیم و شفیق ہیں آپس میں!" — یا جیسے کہ اشارہ فرمایا گیا سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ میں: "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ" کے معجز نما الفاظِ مبارکہ کے ذریعے جن کی نہایت خوبصورت ترجمانی کی ہے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اس شعر میں کہ ؎

"ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ⁘ رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!"

اور یہی ہے وہ حقیقت جسے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیثِ مبارک میں کہ: مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ !" یعنی: "جس نے محبت کی تو صرف اللہ کے لئے کی، اور کسی سے بُغض رکھا تو صرف اللہ کے لئے رکھا، اور کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا، اور روکا تو اللہ کے لئے روکا، اُس نے ایمان کی تکمیل کر لی!" ⁘

ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے اِن دو طرفہ تقاضوں یعنی "اَلْحُبُّ لِلّٰهِ!" اور "اَلْبُغْضُ فِى اللّٰهِ ط!" میں سے مثبت تقاضا یعنی اللہ کے لئے کسی سے محبت کرنا اس قدر دشوار نہیں ہے جتنا کہ منفی تقاضا یعنی غیرت و حمیّتِ دینی کی تلوار سے جملہ دوستیوں، رشتہ داریوں، دیرینہ تعلّقات، طبعی الفتوں اور قلبی محبّتوں کو کاٹ پھینکنا مشکل ہے — اور واقعہ یہ ہے کہ کسی بندۂ مُوحّد کے لئے توحید کے امتحانات میں سب سے

کٹھن امتحان یہی ہے، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

یہ مال و دولتِ دُنیا، یہ رشتہ و پیوند ∴ بُتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۶ میں دُخولِ جنّت کی شرائط کے ضمن میں اس امتحان میں کامیابی کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے کہ :

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ (سورۂ توبہ آیت ۱۶)

(یعنی) کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ یونہی چھوڑ جاؤ گے ؟ حالانکہ ابھی تو اللہ نے دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کن لوگوں نے جہاد کا حق ادا کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی کو دلی دوست نہ بنایا !

اس کیفیت کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ بندۂ مومن کی زبان سے کسی مشرک کے حق میں دعائے مغفرت بھی نہ نکلے، خواہ وہ کتنا ہی قریبی رشتہ دار حتّٰی کہ باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ شرک اللہ تعالیٰ کی جناب میں بہت بڑی گستاخی ہی نہیں کھلی بغاوت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ از رُوئے قرآنِ حکیم یہ ناقابلِ معافی جُرم ہے، جیسے کہ دو بار فرمایا سورۂ نساء میں کہ : اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ یعنی : "اللہ اسے تو ہرگز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، ہاں اس سے کمتر گناہ جس کے چاہے گا بخش دے گا !" جب کہ مشرک کے حق میں استغفار کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ شرک کو قابلِ معافی تصور سمجھا جائے جو نصِّ صریح کے خلاف ہے ۔ الغرض عقل و نقل دونوں کا تقاضا ہے کہ بندۂ مومن کسی مشرک کے حق میں دُعائے مغفرت نہ کرے خواہ وہ اُس کا کتنا ہی عزیز قرابت دار کیوں نہ ہو۔

اس قاعدۂ کلیہ میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ یہ کہ کوئی شخص اگرچہ فی الوقت شرک کی آلائش میں ملوّث ہو لیکن ابھی اُس کی جانب سے مایوسی نہ ہوئی ہو اور کسی بھی درجے میں یہ اُمید باقی ہو کہ شاید وہ راہِ راست پر آجائے اور شرک سے توبہ کرلے تو ایسے شخص کے حق میں دُعائے مغفرت غلط نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اصلاً اُس سے مراد دُعائے ہدایت ہوگی، گویا اس صورت میں : "اے ربّ ! میرے فلاں عزیز کو معاف فرما دے !" کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ : "اے اللہ ! اسے توبہ کی توفیق بخش دے اور راہِ ہدایت پر گامزن فرما دے !" اور ظاہر ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ البتّہ جب یہ بات پورے طور پر کھل جائے کہ

وہ کفر اور شرک پر اڑ گیا ہے تو اس صورت میں اس کے لئے دُعا کے معنی یہ ہیں کہ رشتہ داری کے تعلّق کو خدا کی وفاداری کے تعلّق سے زیادہ اہم اور قوی سمجھا جا رہا ہے، گویا حمیّتِ جاہلی حمیّتِ دینی سے بڑھ کر ہے — اور ظاہر ہے کہ اسے ایمان کے ساتھ کوئی مناسبت حاصل نہیں ہے —!!

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا اپنے والد کے حق میں استغفار دراصل اسی استثناء کے تحت تھا — اور اُصولاً اس کے ضمن میں کسی وضاحت کی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ قرآنِ حکیم میں آنجنابؑ کی جو بعض دعائیں نقل ہوئی ہیں اُن میں اپنے والد کے لئے مغفرت کی درخواست بھی شامل ہے جیسے سورۂ شعراء میں ہے کہ : وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۝ یعنی: "مغفرت فرما دے میرے باپ کی، یقیناً وہ گمراہوں میں سے ہے" یا سورۂ ابراہیم میں کہ : رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ یعنی : "اے ربّ ہمارے! بخش دیجو مجھے بھی اور میرے والدین کو بھی اور جملہ اہلِ ایمان کو بھی جس دن کہ حساب قائم ہوگا" — اس سے ایک مغالطہ پیدا ہو سکتا تھا جس کے سدِّباب کے لئے اس مقام پر وضاحت فرما دی گئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا یہ استغفار اوّلاً تو ایک وعدے کی بنا پر تھا جو انہوں نے اپنے والد سے کر لیا تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ مریم میں بھی ہے اور سورۂ ممتحنہ میں بھی اور پھر یہ جاری بھی صرف اُس وقت تک رہا جب تک کہ انہیں یہ یقین نہ ہو گیا کہ میرا باپ کفر اور شرک پر اس درجہ اڑ گیا ہے، اور اُس کے دل میں اپنے مزعومہ معبودوں کی محبّت نے اس درجہ گھر کر لیا ہے کہ وہ اللہ واحد و قہّار کا دشمن بن چکا ہے اور اب اُس کے راہِ راست پر آنے کی کوئی اُمّید باقی نہیں رہی۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر یہ حقیقت منکشف ہوئی اُس مُوحّدِ خالص نے فوراً اپنے والد سے اعلانِ برأت کر دیا۔ اب اگر ابراہیم علیہ السّلام کو اس حقیقت کے ادراک و شعور میں کچھ دیر لگی تو وہ صرف اس لئے کہ وہ طبعاً نہایت حلیم و رحیم اور شفیق و رفیق تھے — اور طبیعت کی نرمی اور دل کی رقّت اور خلقِ خدا پر رحمت و شفقت ظاہر ہے کہ نہایت محمود صفات ہیں نہ کہ مذموم اور اگر ان کی بنا پر کہیں کسی معاملے میں حدِّ اعتدال سے کسی قدر تجاوز ہو جائے تو یہ یقیناً قابلِ عفو ہے۔ چنانچہ یہی وصف ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ بابرکات میں بھی نہایت شدّت کے ساتھ موجود تھا — اور آپؐ کل خلقِ خدا کے لئے سراپا رحمت و

شفقت تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے حق میں تو آپؐ : عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ کے مصداقِ کامل تھے ہی لیکن بسا اوقات کافر و منافق بھی آپؐ کی طبعی رأفت و رحمت سے غلط فائدہ اٹھا جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں دو بار آپؐ کو تاکید فرمائی گئی کہ :

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ

(یعنی) "اے نبیؐ! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور اُن پر سختی کیجئے!" ——

اور ہم کہتے ہیں کہ اسی : "اَوَّاهٌ حَلِيْمٌ" کی شانِ رفیع کا پرتوِ کامل موجود تھا صدیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ کی سیرت و شخصیت میں! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہُ!) ؎

آیت ۱۱۵ میں اُن اہلِ ایمان کی دلجوئی ہے جو اسی طبعی رأفت و رحمت کے باعث اپنے مشرک اعزّہ و اقارب کے حق میں دُعائے مغفرت کرتے رہے ہوں گے اور اِن آیات کے نزول پر نہایت پریشان و پشیمان ہو گئے ہوں گے۔ اُنہیں تسلّی دے دی گئی کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ کسی کو ہدایت دینے کے بعد اُس سے کسی ایسی تقصیر کے باعث سلبِ توفیق کر کے اُسے گمراہی کے حوالے کر دے جس کی ممانعت کی صراحت نہ کر دی گئی ہو۔ گویا گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط! ——بالکل یہی انداز ہے اُس آیت کا جو تحویلِ قبلہ کے ضمن میں نازل ہوئی کہ : مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ! یعنی "تمہارے ایمان اللہ تعالیٰ ضائع کرنے والا نہیں ہے!" —تم اپنے دلوں میں خواہ مخواہ کی تشویش کو راہ نہ پانے دو۔ اور بالکل یہی بات ہے جو شراب کی آخری اور قطعی حرمت کا حکم نازل ہونے پر فرمائی گئی کہ اس حکمِ صریح کے نزول سے قبل اگر کوئی شراب پیتا رہا تو اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اگرچہ ایسے بھی بے شمار لوگ تھے جنہوں نے ابتدائی اشاروں ہی سے پوری بات پالی تھی اور بہت پہلے مے نوشی ترک کر دی تھی۔ بلکہ وہ بھی تھے جو اس اُم الخبائث کی آخری حرمت کے شدت سے منتظر تھے یعنی حضرت عمرؓ جو : "الّذی وافق رأیہٗ بالوحی والکتٰب" ہی کے نہیں : "الّذی وافق الوحی والکتٰب برأیہٖ" کے مصداقِ اتمّ تھے! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہُ)

اللہ ہر چیز کا علم کامل رکھتا ہے۔ یعنی وہ ہر شخص سے معاملہ اس علمِ کامل کی بنیاد پر کرے گا کہ کب کوئی حقیقت اُس پر منکشف ہوئی اور اس انکشافِ حق کے بعد اس نے

اپنا طرزِ عمل بدل لیا یا نہیں! گویا محاسبۂ اُخروی کا معاملہ دُنیا میں چلنے والی اندھے کی لاٹھی کا سا نہیں ہے۔

آیاتِ سابقہ میں چونکہ سارا معاملہ توحید کی حمایت و حمیّت اور شرک سے بیزاری و نفرت کا زیرِ بحث آیا ہے۔ لہٰذا آیت ۱۱۶ میں توحیدِ کامل کا بیان نہایت جامع اور پُرشکوہ الفاظ میں وارد ہوا یعنی : "اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ، وہی جلاتا بھی ہے اور وہی مارتا بھی ہے، اور تمہارے لئے اس کے سوا نہ کوئی حمایتی یا پشت پناہ ہے نہ معاون و مددگار !" وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

(۸)

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۟ۙ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۱۷ تا ۱۱۸ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"اللہ نے نظرِ کرم فرمائی اپنے نبیؐ پر اور ان مہاجرین اور انصار پر جنھوں نے نہایت مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے بعض کے دل کجی کی جانب مائل ہو جائیں۔ پھر اللہ نے ان پر عنایت فرمائی۔ یقیناً وہ ان کے حق میں نہایت مہربان رحم فرمانے والا ہے، اور ان تین اشخاص پر بھی جن کا معاملہ مؤخّر کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی پوری وسعت کے باوصف ان پر تنگ ہو گئی اور انہیں اپنی جانیں ضیق میں محسوس ہونے لگیں، اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ (کی پکڑ) سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کی (رحمت کے) سوا اور کوئی نہیں۔ تب اللہ ان

کی جانب متوجّہ ہوا تاکہ وہ بھی اُس کی جناب میں توبہ کریں۔ یقیناً اللہ ہی ہے بہت توبہ کا قبول فرمانے والا، رحم کرنے والا!" ـــــ صدق اللہ العظیم

غزوۂ تبوک کے دوران پیش آمدہ حالات و واقعات پر مفصّل تبصرے کے بعد جس میں بالخصوص منافقین کے نفاق کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا گیا۔ اب ان آیات میں اہلِ حق پر اللہ کی رحمت و شفقت، فضل و کرم اور ان کی جملہ کوتاہیوں اور تقصیروں کے ضمن میں عفوِ عام کا اعلان ہو رہا ہے ـــــ!!

اس سلسلے میں لفظِ 'توبہ' جو ان آیات میں بتکرار و اعادہ وارد ہوا خصوصی توجّہ کا مستحق ہے، اس اعتبار سے بھی کہ یہی وہ مقام ہے جس کی بنا پر اس عظیم سورت کا مشہور اور معروف ترین نام ہی 'سورۂ توبہ' قرار پایا ـــــ اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ قرآن حکیم کی ان متعدّد اصطلاحات میں سے ہے جو لفظاً تو اللہ اور بندے دونوں کے لئے مشترک طور پر استعمال ہوتی ہیں، لیکن ان کے مفہوم میں نسبت کے اس اختلاف سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ جیسے 'شکر' کہ جب بندے کے لئے آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے احسان مندی کے اور جب اللہ کے لئے آئے گا تو اس کا مفہوم ہوگا قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا۔ اسی طرح توبہ کا لفظ جب بندے کے لئے آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے "بندے کا گناہ و معصیت کو ترک کر کے پشیمانی کے جذبات اور عفو و درگذر کی درخواست کے ساتھ اللہ کی جناب میں متوجّہ ہونا!" ـــــ اور جب اللہ کے لئے استعمال ہوگا تو اُس کے معنی ہوں گے: "اللہ کا اپنی رحمت و شفقت اور عنایت و کرم کے ساتھ بندے کی جانب متوجّہ ہونا"۔ یہی وجہ ہے کہ بندوں کے لئے استعمال کے موقع پر 'توبہ' کے ساتھ صلہ آتا ہے 'اِلیٰ' کا اور اللہ کے لئے استعمال کے موقع پر صلہ آتا ہے 'عَلیٰ' کا۔ جیسا کہ ان دو آیات میں چار بار ہوا ؛

دوسری اہم حقیقت جو ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ قبولیتِ توبہ کے اس اعلان میں اصل معاملہ تو اُن تین انصاری صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا تھا، جن کا ذکر آیت ۱۱۸ میں وارد ہوا۔ لیکن قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کا اعجازِ کلام کہ آیت ۱۱۷ میں اس اعلانِ عفو کے لئے ایک شاندار تمہید بھی آ گئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سراپا صبر اور پیکرِ صدق و صفا مہاجرین و انصار

سے متعلق بعض نہایت اعلیٰ لیکن حد درجہ لطیف مضامین بھی بیان ہوگئے۔ چنانچہ ان کے حق میں اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کا ذکر بھی شاندار الفاظ میں ہوگیا اور ان کی خطاؤں سے درگذر کا اعلان بھی ہوگیا۔ اگرچہ ایسے معجزانہ انداز میں کہ بظاہر الفاظ تادیب و تنبیہ بھی موجود ہے لیکن بباطن شفقت و عنایت اور تعریف و توصیف ہی نہیں بلکہ تحسین و آفرین کا پہلو غالب ہے ۔

جہاں تک نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تعلّق ہے تو آپؐ کی ذاتِ اقدس پر تو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور عنایتوں کی بدلیاں ہر آن برستی ہی رہتی تھیں اور اللہ کا فضل و کرم آپؐ کے تو ہر دم ہی شاملِ حال رہتا تھا جیسے کہ فرمایا سورۂ بنی اسرائیل میں کہ: "اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝" یعنی: "(اے نبیؐ!) یقیناً اللہ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے!" یہاں بھی آغازِ کلام گویا اسی حقیقت کے اعادے سے ہوا۔ البتہ ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ کی ذات بابرکات میں رأفت و رحمت کے غلبے اور آپؐ کی سیرتِ مطہرہ میں شرافت و مروّت کے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے کے باعث تبوک کے لئے روانگی سے قبل جو صورت پیدا ہوگئی تھی کہ آپؐ نے منافقوں کی جھوٹی معذرتوں کو محض اپنی طبعی شرافت و مروّت کی بنا پر قبول فرمالیا اور ان کے جھوٹ کے پردے کو اُسی وقت چاک کردینے سے محض اپنی نرم خوئی و حیا پسندی کی بنا پر احتراز فرمایا تو اس پر ایک گرفت اسی سورت کی آیت ۴۳ میں وارد ہوئی تھی بدیں الفاظ کہ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ یعنی: "اللہ آپ کو معاف کرے یا اللہ نے آپ کو معاف فرمادیا۔ آپ نے ان کو اجازت کیوں دے دی، یہاں تک کہ کھل جاتا آپ پر کہ کون سچے ہیں اور پہچان لیتے آپ جھوٹوں کو!" ــ اور اگرچہ خود اس گرفت میں بھی پیشگی معافی کا ذکر موجود تھا، اس لئے کہ "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ!" کو جملہ خبریہ مانا جائے تب بھی یہ اللہ کا انشاء ہے خود اپنی ہی جانب گویا مضمون واحد ہے ــ تاہم نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حسّاس قلب کی گہرائیوں میں ہوسکتا ہے کہ کوئی احساس اس کا باقی رہ گیا ہو تو اس آیۂ مبارکہ کے اوّلین الفاظ نے اس کو بالکل محو کردیا۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس سے متصلاً قبل حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ذکر میں "اَوَّاهٌ حَلِيْمٌ" کے الفاظ لاکر جو یقیناً تعریف و تحسین کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ آنحضورؐ کے متذکرہ طرزِ عمل

کے قابلِ تحسین پہلو کی جانب گویا پیشگی اشارہ کر دیا گیا۔ فصلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا ط ؁

اس کے بعد نمبر آیا مہاجرین و انصار کا۔ ان میں سے بھی اگر کسی سے بربنائے طبعِ بشری کوئی خطا یا تقصیر ہوئی ہو تو اس کے ضمن میں بھی عفوِ عام کا اعلان کر دیا گیا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اُن کو بھرپور شاباش بھی دی گئی اور ان کے ثبات و استقلال اور سرفروشی و جانفشانی گویا فی الجملہ صبر و مصابرت پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے گئے۔ چنانچہ اندازِ بیان وہ اختیار کیا گیا جو سورۃ الصّٰفّٰت میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے آخری اور مشکل ترین امتحان کے ضمن میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی: "اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓـؤُا الْمُبِیْنُ ○ ! : "یقینًا یہ ایک بہت کٹھن آزمائش تھی !" — بالکل وہی بات یہاں فرمائی کہ غزوۂ تبوک پورے کا پورا : " سَاعَةِ الْعُسْرَةِ " کا مصداقِ کامل تھا۔ اس لئے کہ ایک تو وقت کی عظیم ترین عسکری قوّت سے مقابلہ تھا۔ پھر قحط کا عالم اور اس پر مستزاد شدید گرمی کا موسم — اور نہایت بعید مسافت اور طویل سفر جس کے دوران وہ وقت بھی آیا کہ پورے دن کے راشن کے طور پر دو دو مجاہدوں میں ایک ایک کھجور تقسیم کی گئی اور نوبت یہاں تک بھی پہنچی کہ ایک ہی کھجور کو متعدّد مسلمان باری باری صرف چُوس کر پانی پی لیتے، اور خود پانی کے ضمن میں نوبت بایں جا رسید کہ سواری کے اونٹوں کے فضلات کو نچوڑ کر جو قدرِ قلیل حاصل ہوا اسی پر قناعت کرنا پڑی۔ ان حالات میں بھی جنھوں نے صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا اُن پر اللّٰہ کی رحمتوں اور عنایتوں کا کیا ٹھکانہ ؟۔ اگر کبھی بربنائے طبعِ بشری کسی کی ہمّت جواب دیتی محسوس ہوئی تو قطعًا قابلِ تعجّب بات نہیں۔ بلکہ قابلِ تحسین پہلو یہ ہے کہ اس کیفیت نے اُن کے سمندِ شوق کے لئے تازیانے کا کام کیا اور : ؏ "رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور !" کے مصداق اُن کے مراتبِ عالیہ بُلند سے بُلند تر ہو گئے — !! (رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہم وارضاہم)

— " خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را !" —

اور پھر ذکر آیا ان تین انصاری صحابہؓ یعنی کعب ابن مالک، ہلال ابن اُمیّہ مرارہ ابن ربیع رضوان اللّٰہ تعالیٰ علیہم کا جو بلاشبہ مومنینِ صادقین میں سے تھے اور ان کا ماضی بے داغ تھا۔ لیکن تبوک کے موقع پر اُن سے تساہل کا ظہور ہوا اور وہ اللّٰہ

کی راہ میں جنگ کے لئے نکلنے کی سعادت سے محروم رہ گئے۔ تاہم تبوک سے واپسی پر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے رہ جانے والوں سے باز پرس کی تو انہوں نے منافقین کی طرح جھوٹے بہانے تراشنے اور جھوٹی قسموں کو اپنے لئے ڈھال بنانے کی بجائے اپنی خطا اور تقصیر کا صاف اعتراف کر لیا۔ نتیجتاً آنحضورؐ نے ان کے لئے مکمل سماجی انقطاع (COMPLETE SOCIAL BOYCOTT) کی سزا تجویز کی جو اُن کے حق میں ایک جانب تو خطا کی سزا تھی اور دوسری جانب ایمان کا امتحان اور خلوص و اخلاص کی آزمائش۔ یہ سزا پورے پچاس دن جاری رہی اور اس کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے یہ حضرات اس میں مکمل طور پر کامیاب اور سرخرو ہوئے۔ لہٰذا ان کی معافی کی بشارت نازل ہو گئی۔ یہ سیرتِ مطہرہ کا ایک نہایت سبق آموز واقعہ ہے اور حضرت کعب ابن مالکؓ نے اسے نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا مطالعہ کتبِ حدیث میں کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کا اصل حاصل اور لُبِّ لُباب وہ ہے جو اس حدیثِ نبویؐ میں بیان ہوا کہ: "کُلُّ بَنِیْ اٰدمَ خَطَّاؤن وَ خَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ" (یعنی تمام انسان انتہائی خطا کار ہیں، اِن خطا کاروں میں بہتر لوگ وہ ہیں جو بار بار توبہ کریں!) اور واقعہ یہ ہے کہ اللہ کو اپنے خطا کار بندوں کی توبہ بہت ہی پسند ہے، اور وہ بہت ہی توبہ کا قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے ❖ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَتَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ٥ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

(۹)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۹ ہے، اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کے ساتھی بنو!"

منافقین کے نفاق کا پردہ چاک کرتے اور ضعیف الایمان لوگوں کے ضعفِ ایمانی پر

تبصرے اور ان کی توبہ کی قبولیت کے اعلان کے بعد یہ آیۂ کریمہ نہایت جامع ہدایت کے طور پر وارد ہوئی ہے — اور اس میں اہلِ ایمان کو دو اقدار کی جانب توجّہ دلائی گئی ہے: ایک منفی قدر ہے یعنی تقویٰ، اور دوسری مثبت ہے یعنی صدق- اور یہ قرآنِ حکیم کے عام اسلوب کے مطابق ہے، یعنی یہ کہ اکثر کلام کا آغاز کسی نفی سے ہوتا ہے اور پھر اثبات وارد ہوتا ہے جیسے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ط یا جیسے: "لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ...... (الیٰ آخر الآیہ)

'تقویٰ' کے لفظی معنی 'بچنے' کے ہیں - اور اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ اس کی ناراضی اور سزا و عقوبت سے بچنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے گناہ و معصیت اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچا جائے- اس اعتبار سے بمقابلہ صدق و احسان اسے ایک منفی قدر قرار دیا جا سکتا ہے- اگرچہ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ ایک قوّتِ محرّکہ یعنی (DRIVING FORCE) بن جاتا ہے، جو انسان کو: ع ـــ ـــ "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں" ـــ کے مصداق اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند تر مراتب کی جانب پیش قدمی پر ابھارتا رہتا ہے، جیسے کہ فرمایا سورۂ مائدہ کی آیت ۹۳ میں کہ:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(یعنی) "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ان پر کوئی گناہ نہیں اس پر جو وہ پہلے کھا پی چکے، جب کہ انہوں نے بعد میں تقویٰ اختیار کر لیا اور ایمان کی راہ اختیار کی اور اچھے عمل کئے، پھر مزید تقویٰ اختیار کیا اور ایمان میں اور آگے بڑھے، پھر مزید تقویٰ اختیار کیا اور درجۂ احسان پر فائز ہو گئے اور اللہ کے محبوب تو محسنین ہی ہیں!"

گویا اسلام، ایمان اور احسان کے مراتبِ ثلاثہ جن کا بیان 'حدیثِ جبریلؑ' میں آیا ہے ان کی جانب پیش قدمی رُوحِ تقویٰ ہی کے زیرِ اثر ممکن ہے اور یہ اللہ کا تقویٰ ہی ہے جو ہر مرحلے پر انسان کا ساتھ بھی دیتا ہے اور بلند تر مراتب کی جانب پیش قدمی پر اسے

اُبھارتا اور اُکساتا بھی رہتا ہے ـــ!!

اِن اعلیٰ مراتب کے بیان کے ضمن میں آیت زیرِ درس میں (ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں کے مصداق "صادقین" کی اصطلاح - گویا) 'صدق' کا وصف لایا گیا ہے۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قرآن حکیم کی نہایت اہم اور اساسی اصطلاح ہے۔ چنانچہ کہیں تو قرآن مجید اسے حقیقی مومن کی تعبیر کے لئے استعمال کرتا ہے جیسے سورۂ حجرات کی آیت ۱۵ میں یعنی :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝	(یعنی) "مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائیں اللہ اور اُس کے رسول پر، پھر شک میں نہ پڑیں اور جہاد کریں اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور اموال کے ساتھ، صرف یہی لوگ سچے ہیں!" (سورۂ حجرات آیت : ۱۵)

کہیں اسی سے تعبیر کیا جاتا ہے حقیقتِ برّ و تقویٰ کو، جیسے کہ آیۂ برّ میں جہاں نیکی کے ایک محدود تصوّر کی نفی اور حقیقتاً نیک اور متّقی لوگوں کے اوصاف کی تفصیلی وضاحت کے بعد فرمایا: "اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (یعنی یہی لوگ ہیں واقعۃً سچے اور یہی ہیں حقیقتاً متقی!) - اسی طرح ایمانِ حقیقی کے لازمی ثمرے یعنی اللہ کی راہ میں گردن کٹوا دینے کو حقیقی کامیابی سمجھنے کو تعبیر فرمایا گیا ہے اسی وصف 'صدق' سے جیسے سورۂ احزاب کی آیت ۲۳ میں یعنی: "مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا لِّیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ!" (یعنی ـــ اہل ایمان میں وہ جوان مرد ہیں جنھوں نے سچ کر دکھایا وہ معاہدہ جو انہوں نے اپنے ربّ سے کیا تھا۔ پس اُن میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے اور وہ بھی ہیں جو اس کے انتظار میں ہیں۔ بہرحال انہوں نے سرِ مُو کوئی تبدیلی نہیں کی۔ تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا بھرپور بدلہ دے گا!"

گویا ایمانِ حقیقی اور اُس کے جملہ ثمرات و نتائج کی تعبیر کے لئے قرآن مجید کا اساسی اور بنیادی لفظ 'صدق' ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کی رُو سے انبیائے کرام کے بعد سب سے اُونچا درجہ 'صدّیقین' ہی کا ہے، جن کی شخصیت اور سیرت و کردار میں سچ

پوری طرح رچا بسا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ صدّیق ' صدق ' سے ' فِعّیل ' کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کے معنیٰ ہیں " پیکرِ صدق و صفا یا سراپا سچّائی اور مجسّم راستبازی !" جیسے کہ ایک متّفق علیہ روایت میں الفاظ وارد ہوئے ہیں نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے کہ " وانّ الرّجل لیصدق حتّٰی یکتب عند اللّٰہ صدّیقًا !" —— (یعنی ایک شخص سچ پر کاربند رہتا ہے یہاں تک کہ اللّٰہ کے یہاں اس کا نام صدّیقین کی فہرست میں درج ہوجاتا ہے !) — اب ظاہر ہے کہ جو خود سراپا صدق ہوگا وہ ہر سچّائی کی تصدیق کے لئے بھی ہمہ تن اور ہمہ وقت تیار رہے گا، اس لئے کہ یہ عقلاً محال ہے کہ جو خود سچّا ہو، اور جس کا اپنا موقف سچّائی اور راستبازی پر قائم ہو وہ سچّائی کا والہ و شیدا نہ ہو۔ یہاں تک کہ کوئی صداقت اُس کے سامنے پیش کی جائے اور وہ اسے ردّ کردے۔ اس کے برعکس ایسے شخص میں سچّائی اور راستبازی کے لئے شدید حمیّت پیدا ہوجانا لازمی ہے اور وہ ہر سچائی کو لپک کر قبول کرے گا، اور ہر صداقت کی بڑھ کر تصدیق کرے گا، اور اس راہ میں نہ اپنی جھوٹی ' انا ' کو حائل ہونے دے گا نہ کسی بر خود غلط خودی کو — نہ کسی مصلحت کو آڑے آنے دے گا نہ کسی مفاد کو، نہ کسی خطرے کو خاطر میں لائے گا نہ کسی اندیشے کو، نہ کسی سے کٹنا اُسے گراں معلوم ہوگا نہ کسی سے ' جڑنا ' نہ کوئی ترک اسے بھاری محسوس ہوگا نہ اختیار، نہ کوئی ' امر ' کٹھن نظر آئے گا نہ کوئی ' نہی ' — بلکہ ' صدق ' اور ' صداقت ' کے ساتھ اُس کا خلوص و اخلاص ان سب مراحل کو آسان بنا دے گا — یہی وجہ ہے کہ علاّمہ آلوسیؒ صاحبِ تفسیر ' رُوح المعانی ' — صدّیق کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں : المتقدم فی التّصدیق والمبالغ فی الصّدق والاخلاص فی الاقوال والافعال !" (یعنی وہ شخص جو تصدیق میں پہل کرے اور خود اپنے اقوال و افعال میں حد درجہ سچّا اور مخلص ہو !) — اور یہ وہی بات ہے جسے قرآن نے سورۂ زُمر کی آیت ۳۳ میں حد درجہ اختصار و جامعیّت اور کمالِ فصاحت و بلاغت کے ساتھ یوں تعبیر فرمایا : وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ (یعنی وہ شخص جو خود بھی صداقت پر قائم رہا اور ہر سچّائی کی تصدیق بھی کرتا رہا !) — یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ نبوّت اور صدّیقیّت کا کیسا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور کیوں سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیٰ نبیّنا وعلیہما الصّلوٰۃ والسّلام کے ذکر میں فرمایا : اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ط (یعنی وہ یقیناً صدیق نبی تھے !) اور

یہیں سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ کیوں حضرت یوسف علیہ السّلام کو اُن کے زنداں کے ساتھیوں نے: "یُوسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیۡقُ!" کے الفاظ سے خطاب کیا، اور کیوں قرآن حکیم نے حضرت مریم سلامٌ علیہا کو "صدّیقہ" قرار دیا، اور کیوں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جدِ امجد حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے لئے: "صادق الوعد" کے الفاظ استعمال ہوئے اور کیوں خود آپؐ کو قریش نے: "الصّادق الامین" کا خطاب دیا۔ (صلّی اللہ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ وسلّم ——!!)

آیت زیرِ درس میں یہ لفظ منافقین کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے جن کا سب سے نمایاں وصف ازرُوئے قرآنِ حکیم و احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام 'کِذب' ہی ہے — جیسے کہ سورۂ منافقون کی پہلی آیت میں فرمایا:

اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَكٰذِبُوۡنَ ۞	یعنی (اے نبیؐ!) جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں — اور اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ اُس کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں!

بلکہ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے نفاق اور ضُعفِ ایمان کے مابین حدِّ فاصل ہی جھوٹے بہانے اور جھوٹی قسمیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت مستند احادیث میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان وارد ہوا کہ: "منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بولتا ہے جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے خلاف ورزی کرتا ہے اور جب امین بنایا جاتا ہے خیانت کرتا ہے"۔ اور ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں اوصاف 'کذب' ہی ہیں۔ پہلا 'کذب' قولی ہے اور باقی دونوں 'کذب' عملی ——!!

ایمان اور نفاق کو صدق و کذب سے تعبیر کرنے کے ضمن میں غالباً اہم ترین مقام سورۂ عنکبوت کا پہلا رکوع ہے جہاں ابتلاء و آزمائش کی حکمت آیت ۳ میں تو ان الفاظ میں وارد ہوئی کہ:

فَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡكٰذِبِيۡنَ ۞	(یعنی) اللہ کھول کر رکھ دے گا کہ کون سچے ہیں —— اور کون جھوٹے!

اور پھر آیت ۱۱ میں پردہ اٹھا دیا کہ سچّوں سے مراد حقیقی مومن ہیں اور جھوٹوں سے منافق۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝

(یعنی) اللہ لازماً ظاہر کر کے رہے گا کہ کون ہیں سچے مومن ــــ اور کون ہیں منافق!

سورۂ توبہ چونکہ نفاق کے موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام یعنی چوٹی ہے اور اس میں اس مرض کی علامات اور اس کی ہلاکت خیزیاں تفصیلاً بیان ہوئی ہیں لہٰذا اب خاتمۂ کلام پر (واضح رہے کہ اس کے بعد اب صرف دس آیتیں اس سورت کی باقی ہیں!) نہایت جامع بات کہہ دی گئی کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ۝

(۱۰)

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۲۰ تا ۱۲۱ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

"مدینہ کے باشندوں اور اس کے گرد و نواح کے بدّوؤں کے لئے ہرگز مناسب نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول سے (علیحدہ ہو کر) پیچھے بیٹھ رہیں، نہ یہ کہ اس کی جان سے بڑھ کر اپنی جان کو عزیز رکھیں۔ یہ اس لئے کہ اللہ کی راہ میں جو پیاس، تھکان

یا بھوک بھی اُن کو لاحق ہوتی ہے اور کفار کو زک پہنچانے والا جو راستہ بھی وہ اختیار کرتے ہیں اور دشمن کو جو چرکا بھی وہ لگاتے ہیں، ان سب کے بدلے میں اُن کے (نامۂ اعمال میں) ایک نیکی کا اندراج ہوتا ہے اور اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ اور (اللہ کی راہ میں) جو بھی چھوٹا یا بڑا انفاق وہ کرتے ہیں اور جس وادی کو بھی وہ طے کرتے ہیں ان سب کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ تاکہ اللہ انہیں اُن کی جانفشانیوں کا بہترین اجر عطا فرمائے۔" صدق اللہ العظیم ۵

جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے یہ خاتمۂ سورت کی آیات ہیں اور ان میں ان طویل مباحث کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب دوبارہ بیان کیا جا رہا ہے جو اس سورۂ مبارکہ میں بیان ہوئے ہیں۔ اہل مدینہ اور آس پاس کے بدّؤوں میں سے جو لوگ نفاق کے روگ میں مبتلا تھے یا جنھیں وقتی طور پر ضعفِ ایمان لاحق ہو گیا تھا ان کے طرزِ عمل پر نہایت مفصّل تبصرہ اس سورت میں آ چکا ہے۔ اب آخری بار ایسے دلنشیں پیرائے میں ملامت کی جا رہی ہے جس سے اگر کسی کے دل میں ایمان کی کوئی دبی ہوئی چنگاری کہیں موجود ہو تو بھڑک اٹھے اور اس کی غیرتِ ایمانی اور حمیّتِ دینی از سرِ نَو جاگ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انداز زجر و توبیخ کا نہیں مشفقانہ و مُربیانہ ملامت کا ہے کہ مدینہ کے رہنے والے ہوں یا آس پاس کے بدّو کسی کے لئے بھی ہرگز زیبا نہ تھا۔ نہ یہ مناسب تھا کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اور ان کے ساتھی مومنینِ صادقین تو سفر کی صعوبتیں بھی جھیل رہے ہوں اور شدید مشقتیں برداشت کر رہے ہوں اور ہر طرح کے خطرات سے دوچار ہوں اور جان کی بازی بھی لگائے ہوئے ہوں اور ان کے نام کا کلمہ پڑھنے والے اور زبانی کلامی طور پر ان کی محبت کا دم بھرنے والے گھروں کی آسائشوں سے متمتّع ہو رہے ہوں اور آرام و عافیت میں دن گذار رہے ہوں۔ گویا انہیں اپنی جان اور اپنا عیش و آرام نبیؐ کی جان سے زیادہ پیارا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل ایمان کے ساتھ ہرگز کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اگر ایمان و اسلام کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص سے کسی وقتی سبب کے باعث یہ طرزِ عمل ظاہر ہوا ہو تو اسے فوراً متنبّہ ہو کر اصلاح کی طرف متوجّہ ہو جانا چاہئے ایسا نہ ہو کہ یہ کیفیت شخصیت میں راسخ ہو جائے اور بالآخر توبہ کی توفیق سلب کر لی جائے ۔

اِس ترہیب کے ساتھ ہی ترغیب و تشویق کے انداز میں فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جو

تکلیف بھی انسان جھیلتا ہے اور مشقّت بھی اٹھاتا ہے اس کا پُورا پُورا اجر و ثواب اللہ کے یہاں اس کو مل جائے گا! چنانچہ راہِ خدا میں اگر انھیں بھوک اور پیاس سے سابقہ پیش آتا ہے، یا جسمانی مشقّت کے باعث کوئی تکان اُن پر طاری ہوتی ہے، یا وہ کوئی ایسا اقدام کرتے ہیں جس سے اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں کو تکلیف یا نقصان پہنچے، یا اللہ کی راہ میں حسبِ توفیق کم یا زیادہ مال وہ خرچ کرتے ہیں، یا دشمنی سے مڈبھیڑ یا اس کے تعاقب میں کسی وادی کو عبور کرتے ہیں تو اُن کی یہ سرفروشیاں اور جانفشانیاں ضائع جانے والی ہرگز نہیں ہیں اور معاملہ وہ نہیں ہے کہ ع "مرگئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی!"۔ بلکہ ان سب کا اندراج اُن کے نامۂ اعمال میں ہو رہا ہے، اور ہر ہر عمل کے بدلے میں ایک ایک نیکی اُن کے حساب میں درج ہو رہی ہے۔ جس کا پورا پورا اجر و ثواب انہیں مل کر رہے گا۔ بلکہ یہ سب کچھ ہے ہی اس لئے کہ اللہ اہل ایمان کے درجات بلند فرمائے اور اُن کی ان سرفروشیوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر بدلہ اُنہیں عطا فرمائے! — گویا بات وہی ہے جو اس سے پہلے آیت ۱۱۱ میں ان الفاظ میں وارد ہو چکی ہے کہ:

"اللہ نے اہلِ ایمان سے اُن کے جان و مال جنّت کے عوض خرید لئے ہیں۔ چنانچہ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ وعدۂ حق ہے اللہ کے ذمّے تورات، انجیل اور قرآن سب کی رُو سے، اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کا وفا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اور خوش خبریاں حاصل کرو اُس سودے پر جو تم نے اُس سے کیا ہے اور حقیقت میں یہی بڑی کامیابی ہے!"

یہاں اصل سوال جو پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ غزوۂ تبوک حیاتِ طیّبہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے دوران کے سلسلۂ غزوات کی آخری کڑی ہے — اور آیاتِ زیرِ درس کے بارے میں یہ بات قطعی اور حتمی طور پر معلوم ہے کہ یہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد نازل ہوئیں۔ تو اب کس مقصد کے لئے اہلِ ایمان کو جہاد و قتال فی سبیل اللہ اور اللہ کی راہ میں سرفروشی و جانفشانی پر اکسایا جا رہا ہے؟ اس کا جواب مضمر ہے 'ختمِ نبوّت' کے ثمرات و لوازم میں جو انبیاء و رُسل علیہم السّلام کی مقدّس جماعت میں آپؐ کا طُرّۂ امتیاز ہے۔ بمثلاً ان ثمرات و لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ آپؐ کی بعثت صرف اہلِ عرب کی طرف نہ تھی بلکہ پوری نوعِ انسانی اور اس سے بھی بڑھ کر کل جنّ و انس کی جانب بھی بھیجے گئے

الفاظِ قرآنی : وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ یعنی: "ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر!" اور — وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝ یعنی: "ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر!" — اس پر مستزاد یہ کہ چونکہ آپ کے بعد کوئی نبی یا رسول آنے والا نہیں ہے لہٰذا آپ کی بعثت موقت نہیں ہے بلکہ دائمی ہے تا قیامِ قیامت! — یہ ہوا اسی ختمِ نبوت کا ایک دوسرا پہلو جسے صحیح تر الفاظ میں اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ آپ صرف بشیر و نذیر، داعی و مبلغ، مربی و مزکی اور معلم و شاہد بن کر نہیں آئے بلکہ اس عظیم مقصد کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں کہ دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ — گویا تمام ادیان اور کُل کے کُل نظامِ زندگی پر غالب کر دیں۔ چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید میں تین مقامات پر ان الفاظِ مبارکہ کے ذریعے واضح کی گئی کہ :

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط

(یعنی، وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الہدیٰ (یعنی قرآنِ حکیم) اور دینِ حق (یعنی اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی) دے کر تاکہ غالب کر دیں اسے کُل کے کُل دین پر!"

— یہ الفاظِ مبارکہ سورۂ صف میں بھی وارد ہوئے ہیں اور سورۂ فتح میں بھی، بغیر اس کے کہ ایک شوشے کا بھی فرق ہو اور ہماری اس وقت کی بحث کے اعتبار سے اہم ترین بات یہ ہے کہ یہی الفاظ جُوں کے توں وارد ہوئے ہیں زیرِ درس سورت یعنی سورۂ توبہ کی آیت ۳۳ میں بھی۔ اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے: 'ایک بعثتِ خصوصی الی اہل العرب' اور دوسرے 'بعثتِ عمومی الی کافۃ الناس و الیٰ یوم القیامۃ'! — چنانچہ آپ کے ابتدائی دعوتی خطبوں میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ: "واللہ الذی لا الٰہ الا ھو، انی لرسول اللہ الیکم خاصۃً و الی الناس کافۃً" یعنی: "اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، میں اللہ کا رسول اور فرستادہ ہوں تمہاری طرف بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم!" — ان میں سے بعثتِ خصوصی کے فرائض تو آپ نے بہ نفسِ نفیس خود ادا فرما دیئے اور اہلِ عرب

پر تبلیغ کا حق ادا کر کے بھی اتمامِ حجت کر دیا اور جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کا جھنڈا بھی لہرا دیا۔ خواہ اس میں آپؐ کو کیسی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں اور مشقتیں برداشت کرنی پڑیں، اور کیسی ہی مشکلات و موانع کا سامنا کرنا پڑا۔ اب اگر آپؐ کی بعثت صرف عرب کی طرف ہوتی تو گویا آپؐ کا مشن مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا بلکہ آپؐ کی بعثت تمام انسانوں اور پورے کُرۂ ارضی کے لئے تھی لہٰذا اس اعتبار سے گویا آپؐ کے مشن کا صرف ایک مرحلہ مکمل ہوا تھا۔ اصل اور عظیم تر مرحلہ ابھی باقی تھا، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

"وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے ❊ نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!"

واضح رہے کہ اس شعر کے مصرعِ ثانی میں علامہ مرحوم نے وہی لفظ استعمال فرمایا ہے جو سورۂ صف اور سورۂ توبہ دونوں میں زیرِ حوالہ آیت کے متصل آیات میں وارد ہوا ہے یعنی: وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ○ اور وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ○ ۔ مزید یہ کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "اِزالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء" میں واضح کیا ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا بہ تمام و کمال ظہور اُس وقت ہو گا جب پورے کُرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا جھنڈا اُسی طرح لہرانے لگے گا جیسے آنحضورؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر لہرا دیا تھا۔ قصہ مختصر صلح حدیبیہ کے بعد ملوک و سلاطین کے نام دعوتی خطوط سے آپؐ نے اپنی جدّوجُہد کے اِس مرحلۂ ثانی کا آغاز فرمایا تھا۔ اسی کے نتیجے میں غزوۂ موتہ واقع ہوا اور پھر سفرِ تبوک سے گویا آپؐ نے اپنی بعثت کے اس عالمی یا بین الاقوامی مرحلے (INTERNATIONAL PHASE) کا شاندار افتتاح بہ نفسِ نفیس فرما دیا — اور اس کی تکمیل کو اُمّت کے حوالے کر کے: "اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی!" کہتے ہوئے محبوبِ حقیقی کی جانب مراجعت فرمائی! — یہ ہے وہ سبب جس کی بنا پر غزوۂ تبوک سے واپسی پر جملہ اہلِ ایمان کو از سرِ نو اپنے باطن میں جھانکنے کی دعوت دی جا رہی ہے، اور جن سے بھی اس مرحلے پر کسی کوتاہی یا تقصیر کا ظہور ہوا انہیں آئندہ کے لئے اصلاح کی ترغیب دی جا رہی ہے اور اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ کے وعدوں کو مزید مؤکّد کیا جا رہا ہے تاکہ اہلِ ایمان باطل کے استیصال اور اللہ اور اُس کے

دین کے دشمنوں کی سرکوبی کے لئے از سرِ نو کمر ہمت کس لیں ۔ اور اللہ کی راہ میں سرفروشی و جانفشانی کا نئے سرے سے عزمِ مصمّم کر لیں ، اور پوری طرح مطمئن رہیں کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے ۔ اُن کی محنت و ایثار کا بھرپور صلہ انہیں مل کر رہے گا اور اس راہ میں ہر ہر قدم پر اُن کے نامۂ اعمال میں ایک ایک نیکی کا اندراج ہوتا رہے گا ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے وعدوں پر یقین کامل عطا فرمائے ۔ اور اپنے دینِ حق کی سربلندی کے لئے ایثار و قربانی کی توفیق بخشے ۔ " شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را ! "

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۱۱)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝۱۲۲

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۲ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :

" اور اہلِ ایمان کے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں پس کیوں نہ نکلی ہر گروہ میں سے ایک جماعت تاکہ فہم حاصل کریں دین کا اور پھر خبردار کریں اپنی قوم کو جب اُن کے پاس لوٹ کر آئیں تاکہ وہ بھی پرہیزگاری کی روش اختیار کریں ! "

یہ آیۂ مبارکہ ' مشکلاتُ القرآن ' میں سے ہے ، اور اس کے مفہوم و مدلول کو قطعیت کے ساتھ متعیّن کرنے میں ایک مشکل حائل ہے اور وہ یہ کہ اس میں اللہ کی راہ میں نکلنے کا جو ذکر آیا ہے اُس سے مراد اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نکلنا ہے یا دین کا علم حاصل کرنے کے لئے نکلنا ۔ اِس لئے کہ اگر توجّہ کو صرف اس آیت اور اس کے الفاظ پر مرتکز کر دیا جائے تو اس کا موضوع جو کافی وثوق کے ساتھ معیّن ہوتا ہے وہ ہے دین کے علم و فہم کے حصول کے لئے نکلنا ۔۔۔ لیکن اگر سیاق و سباق کو دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ سورۂ توبہ کا اکثر و بیشتر حصّہ متعلّق ہے قتال فی سبیل اللہ سے اور اس کا جو سلسلۂ کلام چھٹے رکوع کی پہلی آیت سے شروع ہوا ہے اور جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا ، اس کا مرکز و محور تو ہے ہی غزوۂ تبوک ۔۔۔ اس اعتبار سے آیتِ زیرِ درس میں جس " نفر فی سبیل اللہ "

کا ذکر ہے اس کا مفہوم متعیّن ہوتا ہے قتال فی سبیل اللہ کے لئے نکلنا ــــ چنانچہ چھٹے رکوع کی پہلی آیت میں بھی یہ اصطلاح جُوں کی تُوں وارد ہوئی ہے اور اس میں ہرگز دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ وہاں اس سے مراد ہے سفرِ تبوک کے لئے گھروں سے نکلنا یعنی : یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ؕ (التوبہ) یعنی

"اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہا گیا تو تم زمین کے ساتھ چمٹ کر رہ گئے، کیا تم آخرت کے مقابلے میں دُنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟"

اشکال در اشکال یہ کہ اگر آیتِ زیرِ درس میں "نفر فی سبیل اللہ" کو غزوۂ تبوک سے متعلق مانا جائے تو اس کے معنی یہ بنتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے لئے تمام اہلِ ایمان کا نکلنا ضروری نہ تھا۔ حالانکہ معلوم ہے کہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کے دوران سفرِ تبوک ہی پہلا اور آخری۔ گویا واحد موقع ہے جب کہ نفیرِ عام تھی ــــ اور ہر صاحبِ ایمان کے لئے نکلنا لازم کر دیا گیا تھا ــــ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ نہیں نکلے اُن سے شدید باز پُرس ہوئی جس کا مفصّل بیان آیاتِ سابقہ میں آ چکا ہے ۔

اس مشکل کا ایک حل بعض حضرات نے یہ نکالا ہے کہ یہ آیت ہے تو قتال فی سبیل اللہ ہی سے متعلق ــــ لیکن اس میں ذکر غزوہ تبوک کا نہیں ہے بلکہ یہاں ایک مستقل قانون بیان ہو رہا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کے لئے نفیرِ عام ہمیشہ نہیں ہوتی۔ غزوۂ تبوک تو ایک استثنائی واقعہ تھا ــــ ورنہ ظاہر ہے کہ عام حالات میں جنگ کے لئے تمام مسلمانوں کا نکلنا لازمی نہ ہوگا، گویا یہ فرضِ کفایہ رہے گا۔ اب اگر امام بھی جنگ کے لئے نکلے تو جو اہلِ ایمان اس کے ساتھ نکلیں گے وہ اس کی صحبت سے فیضیاب ہوں گے، اور اس طرح دین کا جو علم و فہم انہیں حاصل ہوگا اسے واپسی پر ان لوگوں تک بھی منتقل کریں گے جو جنگ کے لئے نہیں نکلے تھے، اور اگر امام خود نہ نکلا ہو تو جو لوگ اس کے ساتھ رہ جائیں گے انہیں تفقّہ فی الدّین کے حصول کا موقع ملے گا اور وہ اپنے مجاہد بھائیوں کو اُن کی واپسی پر اس سے بہرہ ور کر سکیں گے۔ یہ مفہوم نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کے دوران کے غزوات اور سرایا پر تو پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اشکال باقی رہتا ہے کہ کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ ابدی ضابطہ ہے۔ حالانکہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد اس کی نوبت شاذ ہی آئی

ہے کہ امامِ وقت خود قتال کے لئے نکلا ہو۔ خلفائے ثلاثہ یعنی ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کا تو اپنے عہدِ خلافت میں جنگ کے لئے نکلنا ہوا ہی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں بھی کوئی جنگ کفار کے ساتھ نہیں ہوئی — اور زمانۂ مابعد میں تو مسلمانوں کی سیاسی و عسکری قیادت اور علمی و روحانی سیادت کبھی شاذ ہی کسی فردِ واحد میں جمع ہوئی ہیں ؛

اس اشکال کے حل کی ایک دوسری صورت جس سے قلب کو قدرے اطمینان حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ اسے دین کے علم و فہم اور تفقہ فی الدین کے حصول کے لئے جماعتوں کی صورت میں گھروں سے نکلنے ہی سے متعلق مانا جائے اور سیاق و سباق کلام کے اعتبار سے اس کا سلسلہ مربوط مانا جائے ان آیات سے جن میں بدوؤں — اور دیہاتیوں کے نفاق کے مرض میں زیادہ شدت اور عمومیت کے ساتھ مبتلا ہونے کا ذکر ہے جیسے کہ آیت ۹۷ میں فرمایا گیا : اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ یعنی (" یہ بدو کفر اور نفاق میں بھی زیادہ شدید ہیں اور اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ نازل فرمایا ہے اُس کے قواعد و ضوابط سے اُن کی ناواقفیت بھی زیادہ قرینِ قیاس ہے، اور اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا ")۔

— اب ظاہر ہے کہ اہلِ مدینہ اور اردگرد کے بادیہ نشینوں کے مابین اصل فرق و تفاوت اسی بنا پر تھا کہ اہلِ مدینہ مسلسل حضورؐ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے اور آپؐ کی تعلیم و تلقین اور تربیت و تزکیہ سے بہرہ ور ہونے کا موقع انہیں وافر طور پر ملتا تھا۔ لہٰذا اُن کے قلوب و اذہان بھی نورِ ایمان سے منوّر ہوتے چلے گئے اور ان میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جذبہ بھی پروان چڑھتا چلا گیا۔ بخلاف بدوؤں کے جنھیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ صحبت سے بہت کم حصہ مل سکا۔ نتیجۃً اُن میں سے بہت سوں کے باطن بھی تاریک رہ گئے، اور ان میں نہ جذبۂ جہاد پروان چڑھ سکا نہ ذوقِ شہادت !! — آیت زیرِ درس میں اس مسئلے کا حل تجویز کیا جا رہا ہے اور وہ بھی قدرے ملامت کے انداز میں کہ یہ صورت اہلِ ایمان کو فوری اختیار کر لینی چاہیئے تھی کہ ہر آبادی یا قبیلے میں سے کچھ دنوں کے لئے اپنے اہل و عیال اور گھر بار سے نکل کر

آتے اور مدینے میں رہ کر صحبتِ نبویؐ اور آپؐ کی تعلیم و تلقین اور تربیت و تزکیہ سے فیضیاب ہوتے اور پھر لوٹ کر اپنی اپنی آبادیوں یا اپنے اپنے قبیلے میں دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیتے۔ تاکہ وہ لوگ بھی ایمان اور اسلام کی حقیقتوں سے بہرہ ور ہوتے اور ان میں بھی تقویٰ و احسان کی کیفیات اور جہاد و انفاق کے جذبات پروان چڑھتے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ اس آیتِ مبارکہ کے ایک ایک لفظ کا حق ادا ہو جاتا ہے بلکہ اس کا ایک ربط بھی سلسلۂ کلام کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب !!

"نفر فی سبیل اللہ" کے اس مفہوم کی تعیین کے علاوہ اس آیۂ مبارکہ میں دو اصطلاحات بہت اہم وارد ہوئی ہیں۔ ایک "تفقہ فی الدین" دوسرے "انذار"۔ فقہ کے اصل معنی ہیں سمجھ، فہم اور شعور ! گویا تفقہ فی الدین کے معنی ہوئے ایسی کیفیت کے حصول کی کوشش کہ دین کی اصل حقیقت انسان کے فہم و شعور میں رچ بس جائے اور اس کے اندر ایک گہری بصیرتِ دینی پیدا ہو جائے۔ ہمارے ہاں دین کے اوامر و نواہی، یعنی فرائض و واجبات اور مکروہات و محرّمات کے تفصیلی علم کے لئے 'فقہ' کی جو اصطلاح رائج ہو گئی ہے اُس کے باعث اکثر و بیشتر اس لفظ کے اصل و وسیع مفہوم سے محرومی اور محجوبیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ شریعتِ اسلامی کی ان تفاصیل اور فروعات کا علم بھی یقیناً تفقہ فی الدین کا ایک جزو ہے اور آیتِ زیرِ درس کا جو ربط آیت ۹۷ سے بیان ہوا ہے اور اس میں "حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ" کے جو الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں اِس سے تو اس حقیقت کی جانب خصوصی اشارہ بھی ملتا ہے۔ تاہم یہ ہے "تفقہ فی الدین" کا ایک جزو ہی، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ نگاہیں کل پر مرتکز رہیں ـــ ورنہ ہو سکتا ہے کہ جزو کل کے لئے بمنزلۂ محاسب بن جائے۔ اب ظاہر ہے کہ علمِ دین کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے دیکھا جائے جیسے تفسیر، حدیث، احکام اور کلام وغیرہ تو ان میں اصل اور کل کی حیثیت یقیناً علم قرآن ہی کو حاصل ہے باقی تمام یا فروع ہیں یا اجزاء ـــ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں آنحضورؐ کی دُعا: "اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ" یعنی (اے اللہ اس نوجوان کو تفقہ فی الدین عطا فرما !) کا ظہور اسی صورت میں ہوا کہ وہ کتاب

اللہ کی تفسیر و تاویل کے سب سے بڑے عالم اور اس اعتبار سے "حبر الامّہ" بن گئے۔ چنانچہ بعض روایات میں اس دُعا کے ساتھ یہ دوسرا ٹکڑا بھی وارد ہوا ہے کہ: "وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ" یعنی (اس میں اپنی آیاتِ مبارکہ کی تاویل کی استعداد پیدا فرمادے!) ـــ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اِس دُعائے مبارک کے کسی عشرِ عشیر کا مصداق بنا دے، وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ــــ!!

دوسرا اہم لفظ "انذار" ہے جس کے معنی ہیں خبردار کرنا۔ یہ لفظ جہاں دعوت و تبلیغِ دین کے ضمن میں اساسی اہمیّت کا حامل ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی: "يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ ہ" یعنی: [اے لحاف لپیٹے والے (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اٹھو اور لوگوں کو خبردار کرو!]۔ اسی طرح تعلیمِ دین کے ضمن میں بھی اصل الاصول کی حیثیّت رکھتا ہے۔ گویا قرآن کی رُو سے تعلیم کے معنیٰ لوگوں کے اذہان میں معلومات کا خزانہ جمع کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد لوگوں کو زندگی کے اصل حقائق[1] سے باخبر کرنا اور اُن کی سعی و جُہد کے رُخ کو دُنیا سے پھیر کر آخرت کی طرف موڑ دینا ہے گویا بقولِ شاعر ؎

علم چہ بود؟ آں کہ رہ بنمایدت ❊ زنگِ گمراہی ز دل بزدایدت!

یعنی اصل علم کیا ہے؟ ــــ وہ جو صحیح راستہ دکھائے اور غفلت کے زنگ کو دُور کر کے اُسے از سرِ نو صیقل کر دے! ــــ اس ضمن میں بھی واضح رہنا چاہیئے کہ اصل اہمیّت قرآنِ حکیم ہی کی ہے۔ جیسے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "انّ ھٰذہ القلوب لتصدءُ کما یصدءُ الحدید اذا اصابہُ الماءُ!" ــــ یعنی (اِن دلوں پر بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہے پر زنگ لگ جاتا ہے اگر اس پر پانی پڑ جائے!) ــــ اِس پر صحابہؓ نے سوال کیا: "فما جلاءُھا یا رسول اللّٰہ" یعنی (اے اللہ کے رسول! پھر اُس کا صیقل کیا ہے؟) ــــ تو آپؐ نے فرمایا: "کثرۃ ذکر الموتِ وتلاوۃُ القرآنِ" یعنی (موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن مجید کی تلاوت!) ــــ اس انذار کا نتیجہ آیتِ زیرِ درس میں آیا: "لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ" کے الفاظ میں۔ حذر کے معنیٰ وہی ہیں جو تقویٰ کے یعنی بچنا ــــ دُنیا میں اللہ کے

[1] جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر ❊ تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ!

احکام کی نافرمانی سے اور آخرت میں عذابِ جہنّم سے ! ❖

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ آیتِ مبارکہ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم و تربیت کے لئے ایک فرمانِ شاہی (ROYAL DECREE) کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اس کے اصول و مقاصد کے ضمن میں ابدی رہنما دستور (ETERNAL-GUIDE) کی حیثیت بھی ! — خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد جب ہمارے اجتماعی ادارے منقسم ہوئے تو اوّلاً سیاست دین سے آزاد ہوئی اور یہ آیۂ مبارکہ دینی تعلیم و تربیت کے نظام کا عنوان بن گئی۔ یہاں تک تو معاملہ کسی قدر غنیمت تھا لیکن بعد میں تقسیم در تقسیم کا یہ عمل اور آگے بڑھا اور خود دینی تعلیم و تربیت نہ صرف مدرسہ و خانقاہ کے جُدا جُدا اداروں کی صورت میں منقسم ہو گئی۔ بلکہ ان کے مابین چشمک بھی پیدا ہو گئی تو حالات زیادہ دگرگوں ہو گئے ❖

دَورِ حاضر میں دین کی اُس وحدتِ کلّی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے جو جماعتیں اور تحریکیں سرگرمِ عمل ہیں۔ اُن کے نظامِ تعلیم و تربیت کے لئے بھی یہی آیۂ مبارکہ نہ صرف یہ کہ جامع ترین عنوان بن سکتی ہے۔ بلکہ اس میں اس کے تمام رہنما اصول (GUIDING-PRINCIPLES) بھی موجود ہیں اور اس کے لئے نہایت زوردار ترغیب و تحریک بھی۔ دین کے علم و فہم کے حصول کے لئے گھروں سے نکلنے کے ضمن میں ایک نہایت پیاری حدیث بھی وارد ہوئی ہے جس کی رُو سے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا :

”من سلك طريقًا يلتمس فيه علمًا سهّل الله لهٗ به طريقًا الى الجنّة ط وما اجتمع قومٌ فى بيتٍ من بيوت الله يتلون كتابَ الله ويتدارسونهٗ بينهم الّا نزلت عليهم السكينةُ وغشيتهم الرّحمةُ وحفّتهم الملٰئكة وذكرهم الله فيمن عندهٗ !“

یعنی جو کوئی کسی راستے پر چلتا ہے علم کے حصول کی خاطر، اللہ اس کے طفیل اس کے لئے جنّت کا راستہ آسان کر دیتا ہے — اور جب کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر قرآن پڑھتے اور اسے آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہیں تو اُن پر سکینت کا نزول ہوتا ہے، اور رحمتِ خداوندی انہیں اپنے سائے میں لے لیتی ہے، اور ملائکہ اُن کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ اُن کا ذکر اپنے مقرّبین کی محفل میں کرتا ہے !

اس حدیث شریف کے پہلے ٹکڑے میں تو گویا دین کے فہم و شعور کے حصول کے لئے دیار دور دُور کے لئے نکلنے کی فضیلت کا ذکر ہو گیا ـــــ اور دوسرے اور طویل تر حصّے میں خود اپنے ہی شہر کے کسی درسِ قرآن کے حلقے کی شمولیت کے لئے گھر سے نکلنے کی فضیلت مذکور ہو گئی ـــــ !! و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

(۱۲)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۳ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :

"اے ایمان والو! جنگ کرو اپنے آس پاس کے کافروں سے، اور چاہیئے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں، اور جان رکھو کہ اللہ کی معیت متقیوں کو حاصل ہوتی ہے ! ـــــ !!"

جہاں تک عمومیتِ الفاظ پر مبنی تاویلِ عام کا تعلق ہے اس آیۂ مبارکہ میں قطعاً کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس لئے کہ کفر اور اسلام بدیہی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں اور منطقی طور پر ان کے مابین بقائے باہمی خارج از بحث ہے۔ گویا ایک بالقوہ جنگ (POTENTIAL WAR) کی حالت تو اُن کے مابین ہر حال میں موجود ہی رہتی ہے، جب بھی اہلِ ایمان کے لئے ممکن ہو نظامِ باطل کے استیصال کے لئے اقدام کرنا ان کے ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ صرف اس صراحت کے ساتھ کہ بفحوائے الفاظِ قرآنی "لا اکراہ فی الدّین" یعنی "دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے !" ـــ افراد کو دین و مذہب کی تبدیلی پر مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ اہلِ ایمان کی جنگ رہے گی جب تک کہ خدا کی بغاوت پر مبنی نظام کو بیخ و بُن سے اکھیڑ کر نظامِ اجتماعی کُل کا کُل اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کے اُصول پر اُستوار نہ ہو جائے ـــ بالفاظِ دیگر دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے نہ ہو جائے ـــ گویا تاویلِ عام کے اعتبار سے اس آیۂ مبارکہ کا مفہوم وہی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ کا ہے یعنی: "وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ" (اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک

کہ فتنہ بالکل فرو ہوجائے اور دین اللہ ہی کے لئے ہوجائے!) — اور جو زیادہ مؤکّد صورت میں وارد ہوا ہے سورۂ انفال کی آیت ۳۹ میں جہاں دین کے ساتھ "کُلُّہٗ" کا اضافہ ہوگیا۔ یعنی: "وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" — (اور جنگ جاری رکھو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لئے ہوجائے!) — پھر یہی مضمون ہے جو اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں آیت ۳۳ میں انتہائی عمومیت کے انداز میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقصدِ بعثت کی وضاحت کے ضمن میں بھی آچکا ہے یعنی: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ — یعنی: "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو الھدیٰ (یعنی قرآن مجید) اور دین حق دے کر، تاکہ غالب کردے اسے تمام کے تمام ادیان یا کُل کے کُل دین پر — خواہ یہ کتنا ہی ناگوار ہو مشرکوں کو!" — اور بالخصوص کفّارِ اہلِ کتاب کے ضمن میں مزید صراحت کے ساتھ وارد ہوا ہے آیت ۲۹ میں یعنی: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ :- "یعنی اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں سے جنگ کرو جو نہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں، نہ حرام جانتے ہیں جسے حرام کیا اللہ اور اس کے رسولؐ نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین حق کی اطاعت، یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں اپنے ہاتھ سے چھوٹے بن کر!" — اب ظاہر ہے کہ اس حکمِ قتال مع الکفّار پر عمل "الاقدم فالاقدم" اور "الاقرب فالاقرب" کے اصول کے مطابق ہی ممکن ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت آیتِ زیرِ درس میں ہوگئی: "الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ" کے الفاظ سے — اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جنگ تو مکروہ چیز ہے اور نیکی اور خدا ترسی سے اس کی کوئی مناسبت نہیں تو ان کے لئے وضاحت فرمادی آیت کے آخری ٹکڑے میں کہ قرآن کے تصورِ برّ و تقویٰ کی رُو سے اللہ کی راہ میں جنگ کرنا ہی عین تقویٰ بلکہ نیکی اور تقویٰ کی معراج یا "ذروۂ سنام" ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ بقرہ میں آیۂ برّ میں وارد ہوچکی ہے جہاں نیکی کے عملی مظاہر میں سب سے اعلیٰ مظہر اللہ کی راہ میں جنگ کے موقع پر صبر و مصابرت ہے

مظاہر کو قرار دیا گیا: بفحوائے الفاظِ قرآنی: "وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ" اور خصوصاً صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، اذیت و تکلیف میں، اور جنگ کے وقت: "اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ"۔ "یہی لوگ ہیں حقیقتاً راست باز اور یہی ہیں واقعۃً متقی!" واضح رہے کہ قرآن حکیم میں اس مضمون کے اعتبار سے نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے سورۂ صف کی آیت ۴ کا یعنی: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ یعنی: "اللہ تو محبت کرتا ہے اپنے ان بندوں سے جو جنگ کرتے ہیں اُس کی راہ میں ایسے صف بستہ ہو کر جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں!"

الغرض یہ تو ہے اس آیۂ مبارکہ کا مفہوم تاویلِ عام کے اعتبار سے اور اس میں ہرگز کوئی اشکال نہیں ہے۔ البتہ تاویل خاص کے پہلو میں ایک اشکال موجود ہے اور وہ یہ کہ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت یہاں وارد ہوئی ہے اس کے اعتبار سے "کفّار" سے مراد کون لوگ ہیں؟

اس ضمن میں ایک بہت بڑی ٹھوکر جو دورِ حاضر کے بعض جدید مفسّرین نے کھائی ہے وہ تو یہ ہے کہ یہاں کفّار سے مراد منافق ہیں۔ یہ دھوکہ انہیں اس وجہ سے لگا کہ سورۂ توبہ کے اس حصّے میں سب سے زیادہ گفتگو منافقین ہی کے بارے میں ہوئی ہے۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ منافقین کے ساتھ قتال نہ کبھی ہوا ہے نہ عقلی و منطقی طور پر ہونا ممکن ہے۔ اس لئے کہ قانونی اعتبار سے منافق مسلمان ہی شمار ہوتے ہیں اور انہیں کلمۂ اسلام کی ڈھال حاصل ہوتی ہے جو گویا سلامتی ہی کا کلمہ ہے! چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ کے دوران منافقوں سے جنگ کا تو ذکر ہی کیا کسی ایک منافق کو بھی قتل نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابیّ کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کئی مواقع پر قتل کی باصرار اجازت چاہی پھر بھی نہ ملی۔ بلکہ منافقین کے بارے میں تو آنحضورؐ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ ان کے صریحاً جھوٹے بہانوں کو بھی بلاردّ و قدح قبول فرمالیا کرتے تھے!

واضح رہے کہ یہ بات سرسری اہمیّت کی نہیں ہے بلکہ اسلام کے دستوری و قانونی نظام کا اہم تقاضا ہے۔ ہاں منافقین کے ذکر کے ساتھ قرآن مجید میں دو مقامات پر 'جہاد'

کا لفظ ضرور آیا ہے۔ یعنی اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۷۳ میں اور سورۂ تحریم کی آیت ۹ میں، جن کے الفاظ میں ایک شوشے تک کا فرق نہیں ہے یعنی: "یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ" : "اے نبی! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو اور اُن پر سختی کرو، اُن کا ٹھکانا جہنّم ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے!" — اب یہ ظاہر ہے کہ جہاد اور قتال کے مابین نہایت عظیم فرق ہے۔ جہاد کا معنیٰ بذلِ جہد میں مبالغہ اور فریقِ مخالف کی کوششوں کو ناکام کرنے کی بھرپور سعی ہے۔ گویا منافقین پر ملامت و سرزنش میں بھی سختی کی جا سکتی ہے اور ان کی چالوں اور سازشوں کا توڑ کرنے کے لئے بھی پوری سعی و جُہد سے کام لیا جائے گا۔ لیکن ان کے ساتھ قتال کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اِلاّ آنکہ وہ کھلّم کھلاّ بغاوت پر اُتر آئیں اور اس طرح اسلام کے نظامِ حدود و تعزیرات کی زد میں آجائیں — !!

بعض دوسرے مفسّرین نے آیت زیرِ درس میں کفّار سے مراد سلطنتِ رُومای ہے جس کے ساتھ پہلا تصادم ۸ھ میں غزوۂ موتہ کی صورت میں ہو چکا تھا — اور دوسرا یہ سفرِ تبوک تھا جو اُن ہی کے مقابلے کے لئے کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس کے دوران مسلّح تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ یہ تاویل سورۂ توبہ کے سیاق و سباق سے پوری مناسبت رکھتی ہے اور منافقین کے ذکر میں اس حکمِ قتال مع الرّوم کا اعادہ اس مناسبت سے ہوا ہے کہ سلطنتِ روما کی عظمت و سطوت کے پیشِ نظر یہ حکم منافقوں پر بہت گراں تھا — اور یہ مرحلہ ان کے لئے نہایت کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ ان کی اِسی کیفیت کا تفصیلی ذکر بعد والی آیات میں آرہا ہے ؏

تاہم اس سے بھی زیادہ انسب تاویل یہ ہے کہ یہاں کُفّار سے مراد مشرکینِ عرب ہیں۔ جن پر پورے اکیس برس کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے کامل اتمامِ حجّت ہو چکا تھا۔ اور اب اللہ تعالیٰ کی مستقل سُنّت کے مطابق اللہ کی جانب سے آخری اور فیصلہ کن عذابِ استیصال کا حکم صادر ہو چکا تھا جو اس سورۂ مبارکہ کے بالکل آغاز میں آیت ۵ میں وارد ہوا ہے، یعنی: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ : یعنی: "جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو قتل کرو مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ اور انہیں پکڑو اور ان

کو گھیرو اور اُن کی گھات میں بیٹھو۔ ہر گھات والی جگہ پر!" ــــــ ظاہر ہے کہ یہ حکم ان منافقوں پر بہت شاق تھا جنھوں نے تاحال اہلِ ایمان اور کفّار دونوں سے میل جول برقرار رکھا ہوا تھا اس انتظار میں کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ تاکہ اگر آخر ہی فتح اہلِ ایمان کی ہو تو ہم ان سے کہہ سکیں کہ: "اِنَّا کُنَّا مَعَکُمْ!" (ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہی تھے!) ــــ اور اگر معاملہ برعکس ہو اور کفّار کا پلڑا بھاری رہے تو ہمارے یہ تعلقات کام آئیں اور ہم ان کے ساتھ کی ہوئی وفاداریوں کا واسطہ دے سکیں۔ مزید برآں ان میں سے بہت سوں کے حقیقی دلی تعلقات بھی کفّار اہلِ کتاب اور مشرکین کے ساتھ تھے اور یہ سورۂ مبارکہ اب ان کے حق میں سیفِ قاطع بن کر نیام سے باہر آ چکی تھی۔ ان کے اس پس منظر میں آیتِ زیرِ درس ایمانِ حقیقی، اور یقینِ قلبی اور برّ و تقویٰ کے عملی تقاضوں کی وضاحت کرتے ہوئے سامنے آتی ہے ــــ اور دوٹوک انداز میں بیان کرتی ہے کہ اگر کسی مسلمان کے دل میں کفّار و مشرکین کے لئے کوئی نرم گوشہ تاحال موجود ہے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔ مومنینِ صادقین کی شان تو وہ ہے جو سورۂ فتح میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ: "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ!" ــــ یعنی: "(کافروں کے حق میں نہایت سخت اور آپس میں یعنی اہلِ ایمان کے حق میں نہایت رحم دل اور نرم خُو!)" ــــ اور سورۂ مائدہ میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ: اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ○ یعنی: "نہایت نرم دل اہلِ ایمان کے لئے اور نہایت زور آور اور زبردست کفّار کے حق میں!)" ــــ وہی بات آیتِ زیرِ درس میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ: "وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَۃً" "اور چاہیئے کہ وہ تمہارے اندر سختی اور شدّت محسوس کریں!" ــــ اور آخر میں کان کھول دینے کے انداز میں فرمایا کہ سُن رکھو اور جان لو کہ حقیقی تقویٰ اور خدا ترسی کا تقاضا یہی ہے، اور اللہ کی نصرت و حمایت اور تائید و توفیق یعنی فی الجملہ اس کی معیّت صرف اہلِ تقویٰ کو حاصل ہوتی ہے!۔ اگر اللہ سے تعلق جوڑنا چاہتے ہو تو اس کے لئے نہ صرف کفر اور شرک سے اظہارِ براءت اور کفّار و مشرکین سے اعلانِ لاتعلقی کرنا ہو گا بلکہ اپنے ہاتھوں سے انہیں قتل کرنا ہو گا۔ خواہ وہ قریب ترین اعزّہ و اقارب اور قدیم ترین احباب اور اولیاء ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر اللہ اور اُس کے رسولؐ کے نزدیک مومنِ صادق کا

رتبہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ کڑوی گولی تمھیں نگلنی ہی ہو گی ۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۱۳)

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝۱۲۴ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۲۵ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۱۲۶ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ۭ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝۱۲۷

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۲۴ تا ۱۲۷ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں : "اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ؟" پس جو (حقیقتاً) ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو اس نے (یقیناً) اضافہ کیا ہے اور وہ (اس سے) بشارت پاتے ہیں۔ البتّہ جن کے دلوں میں روگ ہے اُن کی نجاست میں اُس نے ایک نجاست اور بڑھا دی (یہاں تک کہ) وہ کفر ہی کی حالت میں مرے کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ توبہ کرتے ہیں نہ یاد دہانی حاصل کرتے ہیں ــــ اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے تو وہ (کن انکھیوں سے) ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کسی کی نگاہ تو تم پر نہیں ہے، پھر کھسک جاتے ہیں (اصل میں تو) اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے، اِس لئے کہ یہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ ! صدق اللہ العظیم !!

اِن آیاتِ مبارکہ میں منافقین کے ظاہر و باطن کی ایک بھرپور عکاسی کی گئی ہے

اور اس طرح گویا ایک آئینہ اُن کے سامنے رکھ دیا گیا ہے جس میں وہ اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ منافقین دو قسم کے تھے: ایک وہ جن کے باطن میں ایمانِ حقیقی کی کوئی کرن کبھی چمکی ہی نہ تھی اور حلاوتِ ایمانی کی کوئی رمق انہیں کبھی نصیب ہوئی ہی نہ تھی۔ گویا اسلام میں اُن کا داخلہ ہوا ہی دھوکے اور سازش کے تحت تھا جیسے کہ ذکر ہوا ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷۲ میں: وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ یعنی اہل کتاب میں سے بعض نے یہ سازش کی کہ صبح کو ایمان کا اعلان کرو اور شام کو ارتداد اختیار کرلو تاکہ ایمان کی جو دھاک بیٹھ گئی ہے کہ جو بھی اس کا مزہ چکھ لیتا ہے وہ پھر کسی بھی صورت میں اس سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوتا، وہ ختم ہو جائے اور اس طرح شاید کہ سچے مومنوں میں سے بھی بعض کا یقین متزلزل ہو جائے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قرارداد کے تحت اسلام میں داخل ہوئے انہیں ایک لحظے کے لئے بھی ایمانِ حقیقی کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ اُن کا یہ دُخول و خُروج سورۂ مائدہ کی آیت ۶۱ میں وارد شدہ اِن الفاظ کا کامل مصداق ہے کہ: "وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ" (یعنی "وہ کفر کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے اور اُس کے ساتھ ہی نکل گئے!") — گویا اس دُخول و خُروج کے مابین جو چند ساعتیں انہوں نے بسر کیں اُن کے دوران وہ قانوناً تو مسلمان تھے لیکن حقیقتاً کٹر منافق بلکہ کافر!! — دوسری قسم کے منافق وہ تھے جن کا اسلام میں داخلہ نہ تو کسی سازش یا بدنیتی کے تحت نہیں تھا بلکہ انہوں نے اسلام قبول تو کسی وقتی سے داخلی جذبے یا فوری قسم کی خارجی تحریک کے زیرِ اثر کم و بیش نیک نیتی ہی سے کیا تھا۔ لیکن اُن کی شخصیتیں مریض تھیں اور انہیں 'ضعفِ ارادہ' کا مرض لاحق تھا۔ چنانچہ جب اسلام و ایمان کے تقاضے ان کے سامنے آئے — اور دین کے مطالبات کو پورا کرنے کا وقت آیا تو ان کی ہمتیں جواب دے گئیں اور وہ صبر و ثبات اور استقامت و استقلال کا ثبوت نہ دے سکے۔ معاملہ یہیں تک رہتا تو غنیمت تھا اس لئے کہ یہ لازماً نفاق نہیں ہے بلکہ اسے 'ضعفِ ایمان' قرار دیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کیا جاتا ہے اور اصلاح کی سعیٔ پیہم جاری رکھی جائے لیکن کچھ لوگ دوسری روش اختیار کرتے ہیں اور جھوٹے بہانوں اور عُذراتِ لنگ کے ذریعے

اپنی کوتاہیوں اور تقصیروں پہ پردہ ڈالنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور یہ معاملہ رفتہ رفتہ جھوٹی قسموں تک پہنچ جاتا ہے جنھیں وہ : اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً کے مصداق نظمِ سمع و طاعت کی خلاف ورزی پہ بازپرس اور سرزنش سے بچنے کیلئے ڈھال بنا لیتے ہیں — اور یہ ہے وہ مقام جہاں سے "ضُعفِ ایمان" کی سرحد ختم اور 'نفاق' کی حد شروع ہو جاتی ہے —— پھر جس طرح امراضِ جسمانی کے ارتقائی مراحل ہوتے ہیں جیسے ٹی بی کی پہلی، دوسری اور تیسری 'STAGES' اسی طرح یہ مرضِ نفاق بھی بڑھتا رہتا ہے اور گھناؤنے سے گھناؤنا تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اوّلاً منافقین کے دلوں میں مومنینِ صادقین سے بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ ایمان و اسلام اور جہاد و قتال کے ضمن میں جانفشانی اور سرفروشی سے کام کیوں لے رہے ہیں۔ کیوں نہیں ہماری ہی طرح عُضوِ مُعطّل بن کر بیٹھ رہتے۔ تاکہ ہماری بے عملی بھی زیادہ نمایاں نہ ہو۔ اور پھر بالآخر وہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ ع "بازی بازی باریش بابا ہم بازی!" کے مصداق وہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فقرے چست کرنے شروع کر دیتے ہیں اور آیات و سُوَرِ قرآنی کے تمسخر و استہزاء سے بھی نہیں چوکتے۔ چنانچہ منافقت کی ٹی بی کی یہ ہے وہ آخری اور تیسری سٹیج جس کا نقشہ کھینچا گیا ہے آیات زیرِ درس میں جو سورۂ توبہ کی بھی اختتامی آیات میں سے ہیں اور مرضِ نفاق کے بھی نقطۂ عروج (CLIMAX) کو بیان کر رہی ہیں ۔

قرآنِ حکیم نے اپنا جو ابتدائی تعارف سورۂ بقرہ کے آغاز میں کر دیا ہے اس میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ : يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط یعنی "(اللہ) اسی کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے بہتوں کو ہدایت دیتا ہے!" — اس لئے کہ ہدایت و ضلالت کا معاملہ یک طرفہ نہیں ہے بلکہ دو طرفہ ہے۔ یعنی ایک جانب بندے کی طلب ہوتی ہے اور دوسری جانب اللہ کی توفیق و تیسیر! گویا بندہ اگر طالبِ ہدایت اور جویائے حق ہو اور اس کے لئے فی الواقع محنت کرے تو اللہ اس کے لئے ہدایت کے راستے لازماً کھول دیتا ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی : وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا! — لیکن اگر انسان طالب ہی زیغ و ضلالت کا ہو اور خواہشات و شہوات نے اُس کے فہم و شعور پہ دبیز پردے

ڈال دیئے ہوں جس کی جانب اشارہ ہے آیاتِ زیرِ درس کے آخری الفاظ یعنی: "بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ !" میں یعنی "بوجہ اس کے کہ وہ عقل و فہم سے کام نہیں لیتے !" — تو ہر سیدھی بات بھی اسے اُلٹی نظر آتی ہے، یہاں تک کہ قرآن مجید کی آیاتِ بیّنات سے بھی اُس کے پلّے ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔ چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جسے منافقین نے قرآن کے استہزاء کی بنیاد بنا لیا — یعنی یہ کہ جب کوئی نئی سورت یا آیتیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتیں اور آپ انہیں مسلمانوں کو سُناتے، تو یہ منافق اپنی محفلوں میں مذاقاً ایک دوسرے سے کہتے: "کہو بھئی! اس نئی سورت سے کس کس کے ایمان میں اضافہ ہوا ؟" — اور پھر جواباً قہقہوں کے ساتھ جو فقرے بازی کی جاتی ہوگی اُس کا تصوّر تو بخوبی کیا جا سکتا ہے لیکن "نقلِ کفر، کفر نباشد" کے باوجود اسے زبان سے دُہرانا کسی صاحبِ ایمان کے لئے ممکن نہیں! اس پر اللہ کے جس غضب کا اظہار ہوا وہ لفظ 'رجس' سے بخوبی نمایاں ہو جاتا ہے۔ گویا ان منافقوں کا دلی روگ اب اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ ان کے قلوب گلے سڑے متعفّن گوشت کے لوتھڑے بن گئے ہیں اور اب اعلیٰ سے اعلیٰ عقلی و روحانی غذا بھی: "ہر کہ در کانِ نمک رفت، نمک شد!" کے مصداق اُن کے باطن کی گندگی ہی میں اضافے کا موجب بن سکتی ہے — اور ان کا واحد انجام اب یہ ہے کہ انہیں اسی حالت میں موت آئے، جو بظاہر اسلام اور بباطن بدترین کفر ہے !!!۔

آیت ۱۲۶ میں ابتلاء و آزمائش کی حکمت کی جانب اشارہ ہے۔ اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ابتلاؤں اور امتحانات کا وُرود اسی لئے ہوتا ہے کہ جن کے فکر و عمل میں کوئی کجی راہ پا رہی ہو وہ اس پر متنبّہ ہو جائیں اور اگر خلوص و اخلاص کی کوئی رمق موجود ہو تو فوراً اصلاح پہ کمربستہ ہو جائیں۔ اس اعتبار سے امتحان و آزمائش اللہ کی نعمت ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جن کے باطن کا نور بالکل ہی بجھ چکا ہو۔ اور جن کا خرمنِ ایمان اس طرح جل کر راکھ ہو چکا ہو کہ کہیں کوئی دبی ہوئی چنگاری بھی باقی نہ رہی ہو ان کے حق میں یہ نعمتِ خداوندی مفید نہیں رہتی — اور انہیں نہ توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے، نہ اُن پے بہ پے امتحانات اور آزمائشوں سے یہ کوئی سبق ہی حاصل کرتے ہیں۔ گویا بظاہر اگرچہ یہ مسلمانوں میں شامل ہیں اور بازپرس اور

جواب طلبی کے مواقع پر یہ قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان و اسلام کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن حقیقی اور باطنی اعتبار سے یہ ان کٹّر کافروں کی صف میں شامل ہو چکے ہیں جن کے حق میں نہ کوئی وعظ و تذکیر مفید ہوتی ہے، نہ زجر و ملامت گویا: —
"سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ کے مصداقِ کامل — یعنی: "برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ انہیں متنبّہ کریں خواہ نہ کریں، یہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے اُن کے دلوں، اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے، اور یہ عذابِ عظیم ہی کے سزاوار ہو چکے ہیں!"

آیت ۱۲۷ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں اور محفلوں میں ان منافقین کے رویّے کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قانوناً اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرائے رکھنے کے لئے انہیں جمعہ و جماعات میں حاضری تو دینی پڑتی تھی لیکن یہ سب کچھ ان پر بار ہوتا تھا لہٰذا ہر آن وہاں سے کھسک جانے کا موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ کبھی کوئی جھوٹا عذر تراش کر چل دیتے تھے۔ کبھی ویسے ہی بلا اجازت کھسک جاتے تھے، جس کا ذکر ہے سورۂ نور کی آیت ۶۳ میں کہ: "قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا" (اللہ خوب جانتا ہے تم میں سے ان لوگوں کو جو آنکھ بچا کر کھسک جاتے ہیں!) — یہ معاملہ اس وقت انتہا کو پہنچ جاتا تھا جب قتال یا انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب پر مشتمل آیات نازل ہوتی تھیں۔ اس وقت وہ ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتے تھے کہ مومنین صادقین میں سے کسی کی نگاہ تو ہم پر نہیں اور جیسے ہی اطمینان ہو جاتا تھا کہ اہلِ ایمان کی توجہ کسی دوسری طرف ہے تو وہ رخصت ہو جاتے تھے۔ آخر میں فرمایا کہ وہ سمجھتے ہوں گے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے۔ حالانکہ وہ بدبخت قانونِ خداوندی کی زد میں آ چکے ہیں اور بارگاہِ خداوندی سے دھتکارے جا چکے ہیں۔ گویا اصل میں وہ نہیں پھرے، اللہ نے اُن کے دلوں کو پھیر دیا ہے۔ اس اندازِ بیان سے یہ مغالطہ نہ ہو کہ ان کی گمراہی کا ابتدائی سبب اللہ کا فیصلہ ہے — اس لئے کہ سورۂ صف کی آیت

ء ۵ میں ہدایت و ضلالت کا جو مکمّل ضابطہ بیان ہوا ہے اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ "فَلَمَّا زَاغُوٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ" (یعنی جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے اُن کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا!) —— گویا یہاں یہ وضاحت فرما دی گئی کہ یہ منافق اللہ کے اس اٹل قانون کی زد میں آچکے ہیں اور اب ان کا لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالك!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۱۴)

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾

یہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات (۱۲۸ تا ۱۲۹) ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

"(لوگو!) آگیا ہے تمہارے پاس ایک رسول، خود تم ہی میں سے، بہت گراں گذرتا ہے اس پر تمہارا کسی بھی تکلیف میں مبتلا ہونا، حد درجہ خواہش مند ہے وہ تمہارے حق میں (ہر خیر اور بھلائی کے لئے!) اہلِ ایمان پر نہایت شفیق اور مہربان۔ پھر بھی (اے نبیؐ!) اگر یہ منہ موڑلیں تو کہہ دیجئے: میرے لئے تو اللہ کافی ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی مالک ہے عرشِ عظیم کا!"

سورۂ توبہ کی ان آخری دو آیات میں سے پہلی میں بظاہر عموم الفاظ کے اعتبار سے تو خطاب ہے تمام مسلمانوں سے لیکن سیاقِ کلام کے اعتبار سے اصل رُوئے سخن ہے منافقین کی جانب —— اور دوسری میں بظاہر خطاب ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے لیکن اس میں بھی ایک تعریض ہے ان ہی منافقین پر اور عتاب شدید ہے ان کے حق میں باسلوبِ اعراض ——!!

یوں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کل جہان والوں بلکہ تمام جہانوں کے

حق میں رحمت بن کر مبعوث ہوئے ہیں بفحوائے نصِ قرآنی: "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝" — لیکن اہل ایمان کے حق میں تو اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپؐ کی بعثت اللہ کا سب سے بڑا احسان ہے۔ جیسے کہ فرمایا سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ میں کہ: "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ" (یقیناً اللہ نے بہت بڑا احسان فرمایا ہے اہلِ ایمان پر کہ مبعوث کیا ان میں ایک رسولؐ، خود ان ہی میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی!) — ذرا بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت سورۂ توبہ کی زیرِ درس آیت کا ہر اعتبار سے مثنّٰی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ دونوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو اللہ تعالیٰ کے احسانِ عظیم سے تعبیر فرمایا گیا، دونوں میں آپ کی: "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" ہونے کی صراحت وارد ہوئی اور دونوں میں آپؐ کی تین تین شانوں کا ذکر ہے۔ ایک میں تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت کا — اور دوسری میں: "عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" — "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ" — اور — "بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" کا۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم کی بعض دوسری آیات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں: "مِنْكُمْ" یا "مِنْهُمْ" کے الفاظ سے جس حقیقت کی جانب اشارہ ہوتا ہے وہ ان دونوں آیات میں "مِنْ اَنْفُسِكُمْ" اور "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" کی صورت میں ظہور و انکشاف کے آخری رتبے کو پہنچ گئی ہے — اور اس میں آپ کی ذاتِ اقدس سے 'اپنائیت' اور 'قرب' کا احساس جس شدّت کے ساتھ سامنے آتا ہے اور اس میں کیف و سرور کی جو کیفیت مضمر ہے اسے ہر حسّاس، اور صاحبِ قلبِ زندہ انسان بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ اس قرب اور یگانگت کے مراتب بے شمار ہیں۔ مثلاً جملہ مخلوقات کے لئے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ حضورؐ بھی ان ہی میں سے ہیں۔ اِس سے بڑھ کر معاملہ ہے عالم انسانیت کا کہ اس کے لئے سرمایۂ افتخار ہے یہ بات کہ آپؐ اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر فضیلت حاصل ہوئی اہلِ عرب کو کہ آپؐ ان میں سے ہیں، پھر درجہ بدرجہ نمبر ہے قریش اور بنی ہاشم

کا کہ آپؐ ان میں سے ہیں ـــــ دوسری طرف ایک فخر حاصل ہے جملہ انبیاءؑ و رُسل کو کہ آپؐ ان ہی کی مقدس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک فخر حاصل ہے ہر صاحبِ ایمان کو کہ اسے آپؐ کے دامن سے وابستگی کا شرف بھی حاصل ہے اور "ہم ہی میں سے" ہونے کا وہ مسرور کن احساس بھی جو لفظ 'ایمان' کے اشتراک کی بنیاد پر ابھرتا ہے یعنی: "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ"۔

البتہ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہ سب تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ وہ ہے جس کی رُو سے حضورؐ کسی کے بھی نہیں، صرف اللہ کے ہیں جس کی تعبیر ہے: "لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ!" کے الفاظ میں اور جس کا ظہور ہوا عالمِ علوی میں بھی جہاں سدرۃ المنتہیٰ پر جبریل علیہ السّلام کو بھی پیچھے رہ جانا پڑا اور اس عالمِ ارضی میں بھی جہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی: "و لو کنت متخذاً خلیلاً غیر ربی لاتخذت ابا بکرٍ خلیلاً و لکن اخوۃ الاسلامؐ" پر اکتفا کرنا پڑا۔ یعنی: "اگر میں اللہ کے سوا کسی کو دوست بناتا تو ابوبکر (رض) کو بناتا۔ لیکن میرا خلیل تو بس اللہ ہی ہے، ہاں اخوتِ دینی میں ابوبکر رضؓ سب پر فائق ہیں!"

الغرض کسی صاحبِ ایمان کے لئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں: "مِنْ اَنْفُسِکُمْ" کے الفاظ ہی حد درجہ کیف اور سُرور کے حامل ہیں۔ یہاں ان پر اضافہ ہے "عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ!" کا ـــ پھر: "حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ!" کا اور سب سے بڑھ کر: "بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ!" کا ـــ اور ان کے مابین ربطِ معنوی یہ ہے کہ: "عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ!" کا تعلق صفتِ رافت سے ہے اور "حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ!" کا صفتِ رحمت سے ـــ اور ان کے مابین ربط و تعلق یہ ہے کہ اگر کسی کو کسی دوسرے کی تکلیف کا احساس اپنے دل میں ہو بقولِ شاعر ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ ؛ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

تو یہ رافت ہے۔ (فارسی میں اس کا صحیح ترین ترجمہ 'ہم دردی' ہے!) اور جب وہ ہمہ تن اس تکلیف کو دور کرنے کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے تو یہ رحمت ہے۔ گویا

ؐ اخرجہ الشیخان رح عن ابی سعید الخدری رضؓ۔

یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں تو یہ الفاظ قرآن مجید میں پورے آٹھ بار اسی طرح جوڑوں کی صورت میں آئے ہیں۔ آیتِ زیرِ درس میں نبی اکرمؐ کی شان میں بھی ساتھ ساتھ وارد ہوئے ہیں اور سورۂ حدید میں متبعینِ حضرت مسیح علیہ السّلام کے ذکر میں بھی: "رأفتہ و رحمۃ" کی صفات لازم و ملزوم کی حیثیّت سے آئی ہیں ؛

بہرحال یہ آیتِ مبارکہ جہاں اہلِ ایمان کے حق میں نویدِ جانفزا کی حیثیّت رکھتی ہے وہاں منافقین کی بدبختی کا مرثیہ بھی نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ پیش کر رہی ہے کہ : ع : "چہ سود از رہبرِ کامل تہیدستان قسمت را!" کے مصداق ایسے رحیم و کریم اور شفیق و وُدود پیغمبر کی صحبت کے مواقع حاصل ہونے کے باوجود محروم کے محروم رہ گئے — اور آپؐ کی رأفت و رحمت اور شفقت و مروّت کا الٹا نتیجہ یہ نکلا کہ خود آپؐ پر بھی فقرے چست کرنے سے باز نہ آئے اور "نوبت بایں جا رسید!" کہ آیاتِ الٰہی بھی ان کے تمسخر و استہزاء کا ہدف بن گئیں، فعلیھم لعنۃ اللہ و الملٰئکۃ و الناس اجمعین —!!

آخری آیت میں خطاب کا رُخ تو ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی جانب لیکن اس میں مضمر عتاب ہے ان ہی ملعون منافقین کی طرف کہ اے نبی! اگر اس سارے وعظ و نصیحت اور تنبیہ و تذکیر کے باوجود یہ لوگ اپنا رخ موڑے ہی رہیں تو آپؐ بھی ان کی جانب توجّہ نہ فرمائیں اور ان کے کان کھول دیں کہ مجھے نہ کسی کی نصرت کی ضرورت ہے نہ مدد کی، میرے لئے تو میرا اللہ کافی ہے۔ بقولِ شاعر : ع

"کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!"

اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ میرے مشن کی تکمیل اور اللہ کے دین کے غلبے کا دارومدار اس کی مدد یا نصرت پر ہے تو وہ سخت مغالطے میں مبتلا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو مکّی سورتوں میں سے سورۂ عنکبوت کے آغاز میں ان الفاظ میں وارد ہوئی کہ: "وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝" (یعنی جو کوئی جہاد کرتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے اپنے ہی بھلے کو۔ اور اللہ تو بے نیاز ہے تمام جہانوں سے!) — پھر یہی بات ہے جو زیرِ درس سورت کے چھٹے رکوع کے آغاز میں فرمائی گئی تھی جہاں سے

غزوۂ تبوک کا ذکر شروع ہوا تھا یعنی: "اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ" ! (یعنی اگر تم اِن کی مدد نہ کرو گے تو اللہ نے تو ان کی مدد کی تھی اس وقت بھی جب نکال دیا تھا انہیں کافروں نے (جب کہ ان کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر نہ تھا بلکہ وہ کل دو نفر تھے اور) آپؐ دو میں کے دوسرے تھے، جب کہ وہ دونوں غار میں تھے!) ۔۔۔ واضح رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "حَسْبِيَ اللّٰهُ" کہنے کا حکم قرآن مجید میں دو بار ہوا ہے۔ ایک آیت زیرِ درس میں اور دوسرے سورہ زمر کی آیت ۳۸ میں، اور دو ہی مرتبہ "حَسْبُنَا اللّٰهُ" کے الفاظ اہل ایمان کے قول کی حیثیت سے نقل ہوئے ہیں۔ ایک زیرِ درس سورت ہی کی آیت ۵۹ میں اور دوسرے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۷۳ میں ۔۔۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بندۂ مومن کے قلب کو ہر طرح کے حالات میں ثبات و سکون عطا کرنے کی تاثیر میں ان کلماتِ مبارکہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ آگے فرمایا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ" ! (اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میرا تمام تر توکل اُسی کی ذات پر ہے!) لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کلمۂ توحید ہے، اور جس طرح ایک حدیثِ نبویؐ کی رُو سے ایمان کے بہت سے شعبے ہیں، جن میں سے بلند ترین تو ہے کلمہ "لا الٰه الا اللّٰه" اور ادنیٰ ترین ہے "راستے سے کسی اذیت بخش چیز کو ہٹا دینا!" ۔۔۔ اسی طرح توحید کے شجرۂ طیّبہ کی بھی بہت سی فروع ہیں جن میں 'توحید فی العقیدہ' بھی لازماً شامل ہے اور 'توحید فی الطلب' بھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ توحید کا لبِّ لباب ہے "توحید فی التوکّل!" ۔۔۔ بمصداق الفاظِ قرآنی: "اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا" (یعنی مت سمجھو میرے سوائے کسی اور کو اپنا سہارا یا کارساز!) ۔۔۔ کلمۂ توحید اور توکّل علی اللہ کا یہی ربط و تعلّق سورۂ تغابن کی آیت ۱۳ میں بھی وارد ہوا ہے یعنی: "اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" (یعنی اللہ وہ ہے جس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور اہل ایمان کو تو بس اُسی پر توکّل کرنا چاہیئے!) ۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایمان کے اس لازمی تقاضے پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخر میں فرمایا: "وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ" ۔۔۔ لوح و قلم اور عرش و کرسی وہ حقائق ہیں کہ جن کی کُنہ تک پہنچنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ مختصر مراد یہ کہ اس کل کون و مکان کا اقتدارِ مطلق اور اختیارِ کلّی صرف اور صرف

اللہ کے ہاتھ میں ہے اور "از ماہ تا بہ ماہی !" سب پر اسی کا بلا شرکتِ غیرے تسلّط و استیلاء قائم ہے۔ تو اب جو صرف اُسی کا ہو گیا اور وہ بھی اس کا ہو گیا۔ اس کی عظمتِ شان اور علوِّ مرتبت کے بارے میں کیا تصوّر تم قائم کرو گے؟
صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

اسلام، مسلمان اور قرآن حکیم

اشعارِ اقبال کی روشنی میں

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

بایاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ اُو آساں بمیری

◉

خوار از مہجوریِ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست او
زندہ و پائندہ و گویاست او

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رح

کا ایک سبق آموز واقعہ

بروایت مولانا مفتی محمد شفیع رح

"عوامی درسِ قرآن"

کی ضرورت و اہمیت

ماخوذ از "وحدت اُمت" —— تالیف مولانا مفتی محمد شفیع رح

شائع کردہ —— مکتبہ المنبر —— لائل پور

"شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ مالٹہ کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے بہت اہم بات ارشاد فرمائی۔

جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں، کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے لئے امت کی صلاح و فلاح کے گرد گھومتی تھیں۔ مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جو انکی زبان مبارک پر آیا تھا، ان کے عزم اور مقصد کا پتہ دیتا ہے فرمایا "الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے"۔ جیل کی تنہائیوں میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقاء نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہیے تو فرمایا "اس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف و محنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول

ہے یا نہیں ؟"

مالٹہ کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے، علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ "وہم نے تو مالٹہ کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں" یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں، وہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ "میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔

نباضِ اُمت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایام زندگی میں ضعف و علالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لئے سعی پیہم فرمائے بذاتِ خود درس قرآن شروع کرایا، جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے علما بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی، اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے۔ مگر اس واقعے کے بعد حضرتؒ کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے۔

"آن قدح بشکست و آن ساقی نماند"

آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے۔ قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا ـــــ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی"

ملت کے ایک اور عظیم فرزند

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم

کی رائے جو اس دور میں ظاہر ہوئی جب وہ جمیع اسلامیان ہند کی آنکھ کا تارا تھے اور انہوں نے ابھی انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار نہ کی تھی:

" اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو۔ تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدینِ کاملین کا فقدان اور علماءِ سُوء و مفسدین دجالین کی کثرت ـــــ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیئے کہ " لا یصلح اٰخر ھٰذہ الاُمّۃ الّا بما صلح بہ اوّلھا " یعنی اُمتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں !!

مولانا ابو الکلام آزاد

ماخوذ از " البلاغ " جلد اوّل شمارہ اوّل مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء

فہرست تصانیف

ڈاکٹر اسرار احمد

- تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ ۶/۰
- 'سرافگندیم' یعنی تنظیم اسلامی کے قیام کا فیصلہ ۶/۰
- مطالبات دین (عبادت رب ، شہادت حق، آقامت دین) ۶/۰
- اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام ۱/۰
- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت ۳/۰
- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں ۲/۰
- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (اردو) ۳/۰
- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (انگریزی) ۵/۰
- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (عربی) ۴/۰
- مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ اول ۵/۰
- مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ دوم ۵/۰
- قرآن اور امن عالم ۰/۷۵
- راہ نجات : سورۂ والعصر کی روشنی میں ۲/۰
- علامہ اقبال اور ہم ۱/۵۰
- عظمت صوم ۱/۰
- دعوت الی اللہ ۱/۰
- آیت الکرسی ۰/۳۰
- قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ :

  الفاتحہ تا الکہف ۳/۰

Regd. L. No. 7360
Monthly MEESAQ Lahore
Vol. 29 | MAY 1980 | No. 5

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں وہم پیداست او
زندہ و پائندہ و گویاست او
صد جہانِ تازہ در آیات اوست
عصرہا پیچیدہ در آیات اوست
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است
ایں جہاں اندر برِ او چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش
مے دہد قرآں جہانِ دیگرش
یک جہانے عصرِ حاضر را بس است
گیر اگر در سینہ دل معنی رس است